www.alrisala.org

الرسالہ

Al-Risala

October 2010 • No. 407

وقت کے استعمال کا بجٹ بنایئے، جس طرح
آپ اپنی آمدنی اور خرچ کا بجٹ بناتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اکتوبر 2010

جنوبی ہند کا سفر

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 24355454,41827083,
24356666, 46521511
Fax: 45651771
www.goodwordbooks.com
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10
One year Rs. 100
Two years Rs. 200
Three years Rs. 300

Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

جنوبی ہند کا سفر

جنوبی ہند میں ایک بڑا تعلیمی ادارہ ہے جو جامعہ دار السلام، عمر آباد (تمل ناڈو) کے نام سے مشہور ہے۔ وہ ابتدائی طور پر 1924 میں قائم ہوا اور اب وہ ایک بڑا تعلیمی مرکز بن چکا ہے۔ وہ انڈیا کے چند بڑے اسلامی مدارس میں سے ایک ہے۔ اِس ادارے کی دعوت پر جنوبی ہند کا سفر ہوا۔ 7 جون 2010 کی صبح کو دہلی سے روانگی ہوئی، اور 11 جون 2010 کی شام کو دوبارہ دہلی کے لیے واپسی ہوئی۔ اِس سفر میں مولانا محمد ذکوان ندوی میرے ساتھ تھے۔

اِس سفر کے لیے ہمارا رزرویشن جیٹ ائرویز سے تھا۔ دہلی کا ائرپورٹ دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے۔ نیا ائرپورٹ ترقی یافتہ ملکوں کے معیار پر بنا ہے۔ ائرپورٹ پر بدستور لوگوں کی بھیڑ نظر آئی۔ یہاں کئی لوگوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا گیا۔ لوگوں نے اس کو بڑے شوق سے لیا۔ موجودہ زمانے کے نئے مظاہر میں سے ایک یہ ہے کہ لوگ اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ میڈیا میں بار بار اسلام کی نسبت سے کچھ نہ کچھ خبریں آتی رہتی ہیں۔ اِس سے لوگوں کے اندر تجسس (curiosity) پیدا ہوا ہے۔ وہ اسلام کے بارہ میں مزید جاننا چاہتے ہیں۔

ائرپورٹ کے اندر لوگ تیزی سے اِدھر اُدھر چل رہے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں موبائل تھا اور وہ کان پر موبائل رکھے ہوئے اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے بات کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ ہر ایک، انسان سے باخبر ہے، لیکن کوئی بھی خدا سے باخبر نہیں۔ وہ خدا جس نے اُس کو پیدا کیا، وہ خدا جس نے دنیا میں ایسے اسباب رکھے جن کے ذریعے موبائل اور ہوائی جہاز جیسی چیزیں بنانا ممکن ہوا۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو مخلوق سے باخبر ہیں، لیکن اُنھیں خالق (Creator) کی کوئی خبر نہیں۔

7 جون 2010 کو ہمیں جس فلائٹ (Jet Airways Konnect-9W2255) سے مدراس (چنئی) کے لیے روانہ ہونا تھا، اس کا مقرر وقت صبح ساڑھے دس بجے تھا۔ مگر جہاز ایک گھنٹہ لیٹ ہو کر روانہ ہوا۔ اگلے دن کے اخبار سے معلوم ہوا کہ اِس کا سبب یہ تھا کہ انڈین پرائم منسٹر من موہن سنگھ

اُسی صبح دہلی سے سری نگر (کشمیر) جانے والے تھے۔ اِس بنا پر 50 فلائٹس دیر سے روانہ ہوئیں اور دہلی آنے والی فلائٹس کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ دہلی اترنے کے بجائے جے پور (راجستھان) چلی جائیں۔ اوقات میں اِس تبدیلی کی بنا پر ہزاروں مسافروں نیز ائر پورٹ کے عملہ کو سخت پریشانی ہوئی۔ یہ سب پیشگی اطلاع کے بغیر کیا گیا۔ ہندستان ٹائمز (8 جون 2010) کی رپورٹ کے مطابق، ائر پورٹ کے ایک آفیسر نے کہا کہ ان تبدیلیوں کے بارے میں ہم کو پیشگی طور پر کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی:

There was no prior notice of the VIP movement and as a result flights running low on fuel had to be diverted. ANOTAM (Notice to airmen) should have been issued, so that flight shedules could have been changed accordingly. (p. 3)

دہلی کے انٹرنیشنل ائر پورٹ پر اِسی قسم کا واقعہ 26 مئی 2010 کو ہوا تھا، جب کہ موجودہ انڈین صدر جمہوریہ مسز پرتبھا پاٹل کو اسپیشل جہاز سے چین کے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ سیاسی عہدے داروں کی طرف سے اِس قسم کی بدنظمی کے واقعات بار بار ہوتے رہتے ہیں۔ اُن کو دیکھ کر مجھے یہ حدیثِ رسول یاد آتی ہے: **إذا وُسِّد الأمر إلىٰ غير أهله فانتظروا الساعة (صحيح البخاری، كتاب العلم)** یعنی جب نااہل لوگ عہدے دار بنائے جانے لگیں، تو قیامت کا انتظار کرو۔

پرواز کے دوران جیٹ ائر کی فلائٹ میگزین (Jet Wings) کا شمارہ جون 2010 دیکھا۔ اِس شمارے میں زیادہ تر اشتہارات تھے۔ ایک مضمون کا عنوان یہ تھا:

The Quest for Spirituality

اِس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ ویتنام جنگ (Vietnam War) کے بعد امریکا میں مایوسی کا ایک دور آیا۔ بہت سے نوجوان ہپی (Hippie) بن گئے۔ اُنھیں میں سے شکاگو کا ایک امریکی نوجوان رچرڈ سلاون (Richard Slavin) تھا۔ ویتنام جنگ (1960-1973) کے بعد وہ روحانیت کی تلاش میں امریکا سے نکلا۔ مختلف ملکوں کا سفر کرتے ہوئے وہ انڈیا پہنچا۔ یہاں اس نے بہت سے سوامی لوگوں سے ملاقات کی۔ وہ بھکتی یوگا سے متاثر ہوا۔ اُس نے غاروں اور جنگلوں میں دھیان گیان کیا۔

اس نے اپنا نام بدل کر رادھا ناتھ سوامی (Radhanath Swami) رکھ لیا۔ اس نے اپنے تجربات پر مشتمل انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کا نام یہ ہے:

The Journey Home-Autobiography of an American Swami

تبصرہ نگار (Maria De Luca) کے مطابق، اُس کو وہ سکون نہ مل سکا جس کی تلاش میں وہ امریکا سے نکلا تھا۔ چناں چہ آج کل مذکورہ نوجوان کمیونٹی سروس میں مشغول ہے۔ تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ — یہ کتاب گویا کہ مصنف کے ذاتی کنفیوژن کی ایک دیانت دارانہ یادداشت ہے:

The book is an honest memoir of his personal confusion

اِس قسم کے ہزاروں لوگ ہیں جنھوں نے آشرم میں یا پہاڑوں اور جنگلوں میں میڈیٹیشن (meditation) کے ذریعے ذہنی سکون حاصل کرنا چاہا، مگر اُن کو ذہنی سکون نہیں ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ ذہنی سکون کا راز میڈیٹیشن نہیں ہے، بلکہ مثبت فکر کی بنیاد پر ذہن کی تشکیلِ نو (re-engineering) ہے۔ مگر اربابِ خانقاہ اور اربابِ آشرم دونوں ہی اِس حقیقت سے بے خبر ہیں۔

دہلی ائرپورٹ سے جہاز روانہ ہوا تو فضا میں کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ پھر جب وہ اوپر اٹھ کر 35 ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچا تو کالے بادل جہاز کے نیچے جا چکے تھے اور فضا میں ہر طرف روشن سورج چمک رہا تھا۔ یہ گویا اِس بات کا ایک تمثیلی مظاہرہ تھا کہ اگر انسان مادی اندھیروں سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے تو وہ دیکھے گا کہ ہر طرف سچائی کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔

جہاز کے مسافروں میں کئی لوگوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا گیا۔ انھوں نے اس کو اِس شوق سے لیا جیسے کہ وہ پہلے سے اُس کے منتظر تھے۔ ان میں سے دو لوگوں کے نام یہ ہیں:

Dr. A K Shukla, Dept. of Chemistry, SPM Govt College, Allahahbad, U.P.

Dr. MS Mittri (German) Director Multinational Company, Chennai

دہلی سے مدراس کی دوری ایک ہزار سات سو کلومیٹر (1,700 km) ہے۔ یہ سفر تقریباً ڈھائی گھنٹے میں طے ہوا۔ مدراس ائرپورٹ پر اترتے ہوئے میرے ساتھی نے چاہا کہ وہ قرآن کا

ترجمہ جہاز کے کیپٹن (M Laurens) کو دیں۔ وہ کیبن کے پاس پہنچے تو سب سے پہلے کو پائلٹ (co-pilot) سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام مسٹر شجاع الدین تھا۔ ہمارے ساتھی نے انگریزی ترجمہ کی دو کاپی ان کو دی اور کہا کہ ایک کاپی آپ اپنے پاس رکھئے اور ایک کاپی پائلٹ کو دے دیجئے۔ انھوں نے تعجب کے ساتھ کہا کہ: وہ تو کرسچن (مسیحی) ہیں۔ مختصر گفتگو کے بعد وہ راضی ہوئے کہ قرآن کا یہ نسخہ وہ جہاز کے کیپٹن مسٹر لارینس تک پہنچادیں گے۔

یہی موجودہ زمانے میں تقریباً تمام مسلمانوں کی سوچ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن ان کی اپنی کتاب ہے۔ اگر قرآن، غیر مسلموں کو دیا گیا تو وہ اس کی بے حرمتی کریں گے۔ ''بے حرمتی'' کے اِس تصور کا نتیجہ ہے کہ پرنٹنگ پریس کے پورے دور میں قرآن عملاً صرف مسلمانوں کی کتاب بنا رہا، وہ غیر مسلموں تک بہت کم پہنچ سکا۔

ائرپورٹ کے عملہ میں مدراس کے ایک صاحب انجینئر محمد آزاد جہاز سے اترتے ہی مل گئے۔ انھوں نے بسہولت ائرپورٹ کی تمام کارروائی مکمل کر دی۔ ہم لوگ ائرپورٹ سے باہر نکلے تو وہاں جامعہ دارالسلام کی طرف سے مولانا فیاض الدین عمری اور مولانا سید اقبال احمد عمری اپنے کئی ساتھیوں کے ساتھ موجود تھے۔ مدراس سے جامعہ دارالسلام 180 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ سفر بذریعہ کار طے ہوا۔ روڈ بہت اچھی تھی۔ یہ وہی روڈ ہے جس کو نیشنل ہائی وے (نمبر 46) کہا جاتا ہے۔ اس ہائی وے کو ایک مسلم بلڈر نے بنایا ہے۔

ہماری کار کے ڈرائیور مسٹر مورتی (44 سال) تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ وہ 30 سال سے ڈرائیونگ کا کام کر رہے ہیں، مگر اُن کے ساتھ کبھی روڈ ایکسیڈنٹ کا معاملہ پیش نہیں آیا۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ ڈرائیونگ کے لیے ان کا سادہ فارمولا یہ ہے — پہلے سیفٹی پھر اسپیڈ۔ یہ فارمولا صرف کامیاب ڈرائیونگ کے لیے نہیں ہے، بلکہ اِس فارمولے کی یکساں اہمیت کامیاب قیادت کے لیے بھی ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلم قائدین نے مسلم ملت کو ہر جگہ صرف تباہی سے دوچار کیا ہے۔ اِس کا سبب یہی ہے کہ وہ مذکورہ ڈرائیور کی طرح قیادت کا کامیاب فارمولا دریافت نہ کر سکے۔

راستے میں ہم لوگ عصر کی نماز پڑھنے کے لئے میل وشارم (Melvisharam) میں کچھ دیر کے لیے ٹھہرے۔ میل وشارم، ضلع ویلور (Vellore) کا ایک خوب صورت ٹاؤن ہے۔ یہ مدراس سے 100 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں مسلم تاجروں نے کئی اچھے کالج اور ہاسپٹل قائم کئے ہیں۔ انھیں اداروں میں سے ایک عربی مدرسہ مفتاح العلوم ہے۔ وہ 1976 میں قائم کیا گیا۔ یہاں حفظ کے علاوہ، عالمیت تک درسِ نظامی کی تعلیم ہوتی ہے۔ طلبا کی تعداد تقریباً 500 ہے۔ مفتی ریاض احمد قاسمی اس کے مہتمم ہیں۔ یہاں کے وسیع مہمان خانے میں اساتذہ کی ایک نشست ہوئی۔ اِس موقع پر میں نے جو گفتگو کی، اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

ہندستان میں پچھلی صدیوں میں افغانستان اور ایران وغیرہ کے راستے سے مسلم سلاطین آئے۔ اِن سلاطین نے صرف اپنی سلطنتیں قائم کیں اور سیاسی فتوحات کی تاریخ بنائی۔ انھوں نے یہاں حقیقی معنوں میں کوئی دینی کام انجام نہیں دیا۔ اب ان کی یادگار صرف قلعے اور مقبرے ہیں، اِس کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہندستان میں حقیقی معنوں میں مثبت دینی کام اُن لوگوں نے انجام دیا جن کو علماء اور صوفیا کہا جاتا ہے۔ علماء نے مدرسے قائم کرکے دینی علم کو زندہ رکھا۔ صوفیا نے خانقاہوں کے ذریعے دعوت اور روحانیت اور اخلاقیات کا عمل انجام دیا۔

مدرسہ اور خانقاہ کا طریقہ دوسرے الفاظ میں، غیر سیاسی دائرے میں جدوجہد کا طریقہ ہے۔ تبلیغی جماعت ایک اعتبار سے اِسی طریقِ عمل کا ایک تسلسل ہے۔ انڈیا کی اِس انفرادی صفت کی بنا پر ایسا ہوا ہے کہ موجودہ زمانے میں یہاں ملٹنسی (militancy) نہیں پھیلی، جیسا کہ اکثر مسلم ملکوں میں ہوا ہے۔ مثلاً پاکستان، افغانستان، ایران، وغیرہ۔ میل وشارم میں عصر کی نماز پڑھنے کے بعد ہم لوگ آگے کے لیے روانہ ہوئے۔ یہاں ہمارے ساتھیوں نے اساتذہ اور طلبا کو دعوتی لٹریچر دیا۔

یہ پورا سفر فطرت کے ماحول میں ہوا۔ کشادہ سڑک کے دونوں طرف سرسبز درختوں کے مناظر تھے۔ یہ عام طور پر ناریل کے درخت تھے۔ درختوں کے پیچھے پہاڑی سلسلے نظر آرہے تھے۔ ہلکی بارش نے موسم کو نہایت خوشگوار بنا دیا تھا۔ سڑک کے کنارے کہیں کہیں خوب صورت گاؤں نظر آتے تھے۔

سفر کے دوران ہمارے ساتھی برابر موبائل کے ذریعے باہر کی دنیا سے ربط قائم کئے ہوئے تھے۔ایک طرف دہلی کے لوگوں سے، اور دوسری طرف عمرآباد کے لوگوں سے۔ دہلی سے عمرآباد تک ہمارے ساتھیوں کو پتہ تھا کہ اِس وقت ہم کہاں ہیں۔ یہ سفر کا ایک نیا تصور ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ جولوگ شکایتوں میں جیتے ہیں، وہ بظاہر انسان کے شاکی ہوتے ہیں، لیکن حقیقۃً وہ خداوند ذوالجلال کی ناشکری کا ارتکاب کررہے ہیں۔ اگر وہ سوچیں تو اِس طرح کا سفر قدیم زمانے میں کسی بادشاہ کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ہم لوگ دہلی میں کار سے روانہ ہوئے۔اس کے بعد ہم ہوائی جہاز کے ذریعے مدراس پہنچے۔اس کے بعد ہم دوبارہ کار کے ذریعے جامعہ دارالسلام جارہے ہیں۔ یہ سفر اِس طرح طے ہورہا ہے کہ ہم لوگ ایک طرف اپنے دہلی کے ساتھیوں سے اور دوسری طرف جامعہ دارالسلام کے لوگوں سے پوری طرح مربوط ہیں۔قدیم زمانے میں اِس قسم کا سفر کسی بادشاہ کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ایسی حالت میں ہم کو سپر شکر میں جینا چاہیے، نہ کہ ناشکری میں۔

مدراس سے 180 کلومیٹر کا سفر طے کرکے ہم لوگ 7 جون 2010 کی شام کو مغرب کے بعد جامعہ دارالسلام پہنچے۔ یہاں ہمارا قیام جامعہ کی لائبریری (مکتبہ عمر) کی جدید عمارت میں تھا۔ یہ ایک وسیع دومنزلہ عمارت ہے۔اس میں کتب خانہ، ریڈنگ روم، لیکچر ہال اور کچھ کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ہمارا قیام اِسی مکتبہ کے ایک کمرے میں تھا۔

عمرآباد میں کاکا فیملی کا ایک کافی بڑا فارم ہاؤس ہے۔معلوم ہوا کہ جامعہ کے ذمے داران میرے قیام کا انتظام اِسی فارم ہاؤس میں کررہے تھے۔لیکن کاکا انیس احمد عمری نے اِس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ اِس طرح میں طلبا اور اساتذہ سے دور ہوجاؤں گا اور زیادہ ملاقاتیں اور انٹریکشن نہ ہوسکے گا۔ چناں چہ کاکا انیس احمد عمری کی مداخلت سے، میرے لیے لائبریری کی مذکورہ عمارت میں قیام کا انتظام کیا گیا۔ یہ میرے ذوق کے عین مطابق تھا۔اِس طرح میرے لیے ممکن ہوگیا کہ جامعہ میں قیام کے دوران وہاں کے مواقع کو میں پوری طرح استعمال کرسکوں۔

ہم لوگ مغرب کی نماز سے فارغ ہوئے تھے کہ جامعہ کے ذمے داران اور اساتذہ ملاقات

کے لیے آ گئے — مولانا کا کا سعید احمد عمری (معتمد عمومی جامعہ)، مولانا کا کا انیس احمد عمری، مولانا ڈاکٹر عبداللہ جولم، مولانا ابوالبیان حماد عمری، وغیرہ۔ اِن حضرات سے کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ ان کے ذریعے جامعہ دارالسلام کے بارے میں کئی معلومات حاصل ہوئیں۔

میں نے کہا کہ جامعہ دارالسلام کے بانی کا کا عمر (وفات: 1928) واقعی معنوں میں ایک صاحبِ بصیرت انسان (man of vision) تھے۔ وہ اگرچہ ایک تاجر تھے، لیکن انھوں نے جدید دور کے لیے تعلیم کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے مطابق، جامعہ دارالسلام کی بنیاد رکھی، جو اب اپنی وسعت اور اہمیت کے اعتبار سے ایک دینی یونی ورسٹی کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔

گفتگو کے دوران مولانا کا کا سعید احمد عمری نے جو باتیں بتائیں، اُن میں سے ایک یہ تھی کہ اِس علاقے میں کوئی ہندو مسلم مسئلہ نہیں۔ یہاں دونوں فرقوں کے لوگ باہم بھائی کی طرح رہتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات جیسی کوئی چیز یہاں کبھی پیش نہیں آئی۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کے بارے میں اردو اخبارات کے متعصّبانہ بیان کو میں درست نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ آزادی کے بعد ہمارے

قدیم مسجد، جامعہ دارالسلام، عمر آباد

علاقے میں 18 بڑے مسلم کالج قائم کئے گئے ہیں جن کو حکومت کا گرانٹ حاصل ہے۔ یہ تمام مسلم کالج نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔

گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ ملت کی تعمیر کا کام موثر طور پر صرف اُس وقت ہوسکتا ہے جب کہ اُس کو سیاست سے الگ رکھ کر کیا جائے۔ مولانا کا کا سعید احمد عمری نے اِس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی (وفات: 1956) نے یہ تصور پیش کیا تھا کہ کالجوں میں تعلیم پانے والے مسلم طلبا کے لیے شہروں میں مسلم ہاسٹل بنائے جائیں۔ یہاں ان کی رہائش کا انتظام ہو اور اِسی کے ساتھ ان کی دینی تربیت کی جائے۔ شمالی ہند میں سیاسی ذہن کی بنا پر اِس قسم کا کوئی ہاسٹل نہ بن سکا، مگر جنوبی ہند کے مسلمانوں میں چوں کہ سیاسی ذہن نہیں تھا بلکہ تعمیری ذہن تھا، اِس لیے انھوں نے جنوبی ہند میں اِس طرح کے مسلم ہاسٹل بنائے۔ مثلاً حیدرآباد میں اور بنگلور میں۔ بنگلور کا ہاسٹل زیادہ بڑا ہے اور اس کا نام یہ ہے — بنگلور مسلم سنٹرل ہاسٹل۔

اِس مجلس میں جو باتیں ہوئیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ مسلم دنیا میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ امریکا اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔ عرب لوگ کہتے ہیں کہ: أمریکا عدوّ الإسلام رقم واحد۔ میں نے کہا کہ میں 13 بار امریکا گیا ہوں، اور اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکا نہ پرو مسلم (pro-Muslim) ہے، اور نہ اینٹی مسلم (anti-Muslim)۔ وہ صرف پرو امریکا (pro-America) ہے۔ امریکا میں بلا امتیاز ہر ایک کو پوری آزادی حاصل ہے۔ چناں چہ مسلمان اِس آزادی کو استعمال کرتے ہوئے وہاں بڑے بڑے اسلامی کام کر رہے ہیں۔ موجودہ زمانے میں 57 مسلم ملک ہیں۔ مگر یہ کہنا غالباً درست ہوگا کہ اِس وقت اسلام کی خدمت کے جتنے مواقع امریکا میں ہیں، وہ غالباً کسی مسلم ملک میں بھی نہیں۔ کا کا سعید احمد عمری نے اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر کہا کہ میں آپ کی اِس بات سے پوری طرح اتفاق رکھتا ہوں۔

مجلس میں گفتگو کے دوران ایک صاحب نے کہا امریکا کی ترقی کا راز یہ ہے کہ دنیا کے اعلیٰ ذہن رکھنے والے افراد کو امریکا خرید لیتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ خرید وفروخت کی بات نہیں ہے، بلکہ یہ

مواقع (opportunities) کی فراہمی کی بات ہے۔ امریکا نے یہ کیا کہ اُس نے وہاں ہر قسم کے اعلیٰ مواقع فراہم کر دیے — اظہار خیال کی مکمل آزادی، مطالعے کے لیے بہترین لائبریریاں، لیاقت کا بلا امتیاز اعتراف، ترقی کے مواقع کو ہر ایک کے لیے یکساں طور پر کھولنا، وغیرہ۔ اِس بنا پر تمام دنیا کے ذہین لوگ وہاں پہنچ گئے۔

7 جون 2010 کو عشاء کی نماز جامعہ دارالسلام کی قدیم مسجد (1344/1925ھ) میں ادا کی گئی۔ نماز کے بعد مسجد میں یہاں کے کئی اساتذہ سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک جامعہ کے شیخ التفسیر مولانا سید عبد الکبیر عمری صاحب تھے۔ ان کی پیدائش 1923 میں ہوئی۔ انھوں نے جامعہ دارالسلام میں تعلیم پائی، پھر وہ یہیں استاد کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ معمر ہونے کے باوجود وہ ابھی تک پوری طرح صحت مند ہیں۔

نماز کے بعد ہم لوگوں کو کاکا سعید احمد عمری کے گھر لے جایا گیا جو عمر آباد میں مسجد کے بالکل قریب واقع ہے۔ یہاں شام کا کھانا کھایا گیا۔ کھانے کی میز پر تقریباً 10 آدمی موجود تھے۔ کھانے کے بعد یہاں دیر تک نشست ہوئی جس میں مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال ہوا۔

مولانا کاکا سعید احمد عمری نے کہا کہ جامعہ کے اندر مسلکی تعصب اور تنگ نظری نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو آپ کا مسلک معلوم ہے۔ آپ کے مسلک سے اتفاق کی بنا پر ہی ہم نے جامعہ میں آپ کو دعوت دی ہے۔ انھوں نے کہا کہ — مجموعی اتفاق ہی کا نام اتفاق ہے۔ جزئی اختلافات تو ہر جگہ اور ہر شخص کے اندر پائے جاتے ہیں۔

مولانا فیاض الدین عمری نے کہا کہ میں اِس کی تائید کروں گا کہ جامعہ کے اندر مسلکی تشدد بالکل نہیں پایا جاتا۔ انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ میں نے جامعہ کے سینئر استاد دکتور عبداللہ جولم صاحب سے **بداية المجتهد** پڑھی ہے۔ مولانا اگرچہ سلفی ہیں، مگر دلیل کی موجودگی میں انھوں نے ہمیشہ ائمہ کی رائے کو ترجیح دی ہے۔ اور کبھی اُن سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی رائے کا بھی اظہار فرمایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ کے ذمے داران مسلک کے اعتبار سے اگرچہ سلفی ہیں، لیکن جامعہ کی قدیم

مسجد میں وہاں کے امام ایک حنفی ہیں۔ جامعہ کے اندر لمبی مدت گزارنے کے باوجود ہم کو بہت سے اساتذہ کا مسلک معلوم نہیں۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ کا ایک امتیاز یہ ہے کہ یہاں کے ذمے داران ہمیشہ اپنے چھوٹوں سے رائے لیتے ہیں اور ان کو آگے بڑھاتے ہیں۔

گفتگو کے دوران کاکا سعید عمری صاحب نے کہا کہ عام طور پر لوگ دوستوں کو حقِ تنقید دیتے ہیں، مگر وہ اجنبی آدمی کو حق تنقید نہیں دیتے۔ اگر کوئی اجنبی آدمی ان پر تنقید کردے تو وہ بپھر اٹھتے ہیں۔ یہ طریقہ درست نہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ دوستوں کے علاوہ، اجنبی لوگوں کو بھی حقِ تنقید دے۔ وہ ایک اجنبی آدمی کی بات کو بھی اُسی طرح سنے جس طرح وہ اپنے دوستوں کی بات کو سنتا ہے۔ کاکا سعید احمد عمری نے گفتگو کے دوران کہا کہ جامعہ دارالسلام کا نشانہ بنیادی طور پر صرف دو چیزیں ہیں — دعوت، اور آخرت۔ دعوت برائے آخرت اور آخرت برائے دعوت، یہی جامعہ کا اصل نشانہ ہے۔

اِس سلسلے میں طلبہ جامعہ کے سامنے کاکا سعید احمد عمری کے ایک بصیرت افروز خطاب کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے: ''اِس وقت ہم علماءِ کرام کو اپنی دعوتی ذمے داری کو محسوس کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ ہم برادران وطن کے ساتھ اپنے تعلقات کو بڑھائیں، انھیں اپنی محبت کا موضوع بنائیں، اپنی تقریبات میں انھیں مدعو کریں اور جب بھی، جہاں بھی موقع ملے، اُسے غنیمت جان کر اسلام کا پیغام ان کی خدمت میں پیش کرنے، انھیں اسلام کا صحیح تعارف کرانے اور ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ بدقسمتی سے ہمارے رہنماؤں نے امت کو برادرانِ وطن کے ساتھ نفرت کرنا ہی سکھایا ہے، اُن سے محبت کرنا نہیں سکھایا۔ برادرانِ وطن ہمارے لیے مدعو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب تک ہم اُن کے ساتھ محبت سے پیش نہیں آئیں گے، ذرا سوچئے، اُس وقت تک وہ ہماری باتوں پر کیسے توجہ دیں گے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اُنھیں ابدی جہنم سے بچانے کی فکر اور تڑپ ہمارے دل میں کیسے پیدا ہوگی''۔ (ماہ نامہ راہِ اعتدال، عمرآباد، جون 2010، صفحہ 51)

7 جون 2010 کی شام کا کھانا اِس انداز کا تھا جس کو عام طور پر ''پُرتکلف عشائیہ'' کہا جاتا ہے۔ بعد کو میں نے یہاں کے منتظمین سے کہا کہ میں اِس قسم کے کھانے کا عادی نہیں ہوں۔ میں یہاں

جب تک ہوں، میں صرف جامعہ کے مطبخ (مطعم) کا کھانا کھاؤں گا، یعنی وہ کھانا جو جامعہ کے طلبا کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ میرے کھانے کا ٹائم بھی وہی ہوگا جو جامعہ میں عام طور پر طلبا کے کھانے کا ٹائم ہوتا ہے۔ چناں چہ جب تک میں یہاں رہا، مطبخ کا کھانا کھاتا رہا۔ یہ کھانا بالکل سادہ تھا اور میرے ذوق کے عین مطابق تھا۔

مولانا اسرار الحسن عمری جو یہاں ہم لوگوں کے کھانے وغیرہ کے ذمے دار تھے، انھوں نے بتایا کہ اگلے دن صبح کو مجھے جامعہ کے دفتر میں بلایا گیا۔ نائب ناظم جامعہ مولانا ظفر الحق شاکر عمری نے مجھ سے پوچھا کہ مولانا وحید الدین خاں صاحب کے کھانے وغیرہ کا کیا انتظام ہے۔ میں نے کہا کہ مولانا نے کہا ہے کہ میں جب تک جامعہ میں ہوں، مطبخ کا کھانا کھاؤں گا۔ میرے لیے الگ سے کوئی اہتمام نہ کیا جائے۔ میری بات سن کر نائب ناظم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ: **فکل مشکلة حلّت** (پھر تو ساری مشکل آسان ہوگئی)۔ کیوں کہ مہمانوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ان کے کھانے کا ہوتا ہے۔

کاکا سعید احمد عمری صاحب کے گھر سے کھانا کھا کر ہم لوگ واپس جامعہ کے کیمپس میں آ گئے۔ یہاں کئی علماء کے ساتھ میں دیر تک جامعہ کی کھلی فضا میں واک (walk) کرتا رہا۔ میں نے کہا کہ قرآن کی سورہ آل عمران میں ذکر کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: **الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلی جنوبھم** (3:191)۔ میں نے کہا کہ میں نے اپنے تجربے کے مطابق، اِس میں ایک اور ذکر کا اضافہ کیا ہے، اور وہ ہے واکنگ ذکر (walking zikr)۔ میرا معمول ہے کہ میں روزانہ واک کرتا ہوں۔ مگر میری واک صرف واک نہیں ہوتی، بلکہ وہ واکنگ ذکر ہوتی ہے۔

ذکر کیا ہے۔ ذکر دراصل تفکر کا نام ہے۔ سلفِ صالحین نے ذکر کا یہی مطلب بتایا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو علامہ ابن قیم (وفات: 751ھ) کی کتاب: **مفتاح دار السعادة ومنشور ولایة العلم والإرادة**۔ علامہ ابن قیم نے اِس کتاب میں تذکر اور تفکر کو ہدایت کی اصل قرار دیا ہے (**التفکر والتذکر أصل الهدى والفلاح، هما قطبا السعادة**)۔ تفکر کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مثلاً یہاں آپ جامعہ کے کیمپس میں واک کر رہے ہیں۔ یہاں چاروں طرف

سرسبز درخت کھڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ نے درخت کو دیکھا۔ آپ کو یاد آیا کہ درخت اپنے اندر ایک انوکھی صفت رکھتا ہے، وہ یہ کہ وہ ایک نمو پذیر وجود (growing entity) ہے۔ درخت کے بارے میں اِس طرح سوچتے ہوئے آپ کو یاد آیا کہ ایمان کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ایمان بھی ایک نمو پذیر حقیقت ہے۔ حقیقی ایمان وہی ہے جس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔ اِسی لیے قرآن میں کلمۂ ایمان کو درخت سے تشبیہہ دی گئی ہے (14:24)۔ البتہ دونوں کے درمیان ایک فرق ہے۔ وہ یہ کہ درخت کی نمو پذیری قانونِ فطرت کے تحت ہوتی ہے، لیکن انسان خود اپنے ارادے کے تحت غور وفکر کرتا ہے اور اِس طرح وہ خود اپنے ارادے کے تحت اپنے ایمان میں اضافہ کرتا ہے۔

واک کرنے کے بعد ہم لوگ اپنی قیام گاہ (مکتبہ عمر) پر آ گئے۔ یہاں کمرے میں دوبارہ تقریباً 10 علماء اکھٹا ہو گئے۔ ان سے دیر تک دینی اور دعوتی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اُس وقت ایک بات میں نے یہ کہی کہ جو لوگ صرف عوام کے درمیان کام کرتے ہیں، عام طور پر ان کا ذہنی ارتقا نہیں ہوتا۔ لیکن جو لوگ خواص کے درمیان دعوتی کام کریں، ان کا مسلسل ذہنی ارتقا ہوتا رہے گا۔ گویا کہ عوام کے درمیان دعوتی کام یک طرفہ نوعیت کا کام ہے، یعنی ایک سننے والا ہے اور دوسرا سنانے والا۔ اِس کے برعکس، خواص کے درمیان دعوتی کام دوطرفہ عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس میں ایک طرف مدعو کو نئی باتیں ملتی ہیں، اور دوسری طرف داعی کو ڈسکشن اور ڈائلاگ کے دوران نئی نئی باتیں سیکھنے کا موقع ملتا ہے— پہلا طریقہ اگر یک طرفہ تعلیم (unilateral learning) پر مبنی ہے، تو دوسرا طریقہ دوطرفہ تعلّم (bilateral learning) پر مبنی۔

اِسی طرح میں نے ایک بات یہ کہی کہ قرآن میں چار قابلِ انعام گروہوں کا ذکر آیا ہے: **مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين ، والصديقين، والشهداء، والصالحين** (4:69)۔ میں نے کہا کہ میری سمجھ کے مطابق، اِس آیت میں انبیاء سے مراد پیغمبر ہیں، اور صدیقین سے مراد اصحابِ پیغمبر، اور شہداء سے مراد دعاۃ کا گروہ ہے۔ صالحین سے مراد وہ افراد ہیں جن کے لیے قرآن میں دوسری جگہ **مقتصد** (35:32) کا لفظ آیا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ معرفت کے تمام درجات اپنی

نوعیت کے اعتبار سے آج بھی پوری طرح کھلے ہوئے ہیں، حتی کہ وہ اعلیٰ درجہ بھی جس کے بارے میں حدیث میں اِس قسم کے الفاظ آئے ہیں: **عبادٌ لیسوا بأنبیاء ولا شهداء یغبطهم النبیون والشهداء لمقعدهم وقربهم من الله یوم القیامة** (مسند احمد، جلد 5، صفحہ 341)۔ انبیاء کے اِس رشک کا سبب غالباً یہ ہوگا کہ جو درجۂ معرفت انبیاء نے فرشتہ جبریل کے ذریعے حاصل کیا، اُسی نوعیت کی معرفت یہ لوگ فرشتہ جبریل کے بغیر حاصل کرلیں گے۔ معرفت کا یہ حصول بعد کے زمانے میں اہلِ ایمان کے لیے سائنسی دریافتوں کے ذریعے ممکن ہو سکے گا۔

دہلی کے مقابلے میں عمر آباد کا موسم بہت خوش گوار تھا۔ دہلی میں درجۂ حرارت 41 ڈگری تھا، جب کہ یہاں کا درجہ حرارت 31 ڈگری ہے۔ رات نہایت سکون کے ساتھ گزری۔ 8 جون 2010 کو فجر کی نماز ہم لوگوں نے جامعہ دار السلام کے کیمپس کے اندر واقع مسجد سلطان میں پڑھی۔ یہ مسجد 1993 میں بنائی گئی۔ مسجد کافی وسیع اور سادہ تھی۔ عام روایت کے خلاف اِس مسجد میں صرف ایک مینار بنایا گیا ہے۔ ایک مینار کا طریقہ مجھے پسند ہے۔ ایک مینار توحید کی علامت معلوم ہوتا ہے۔

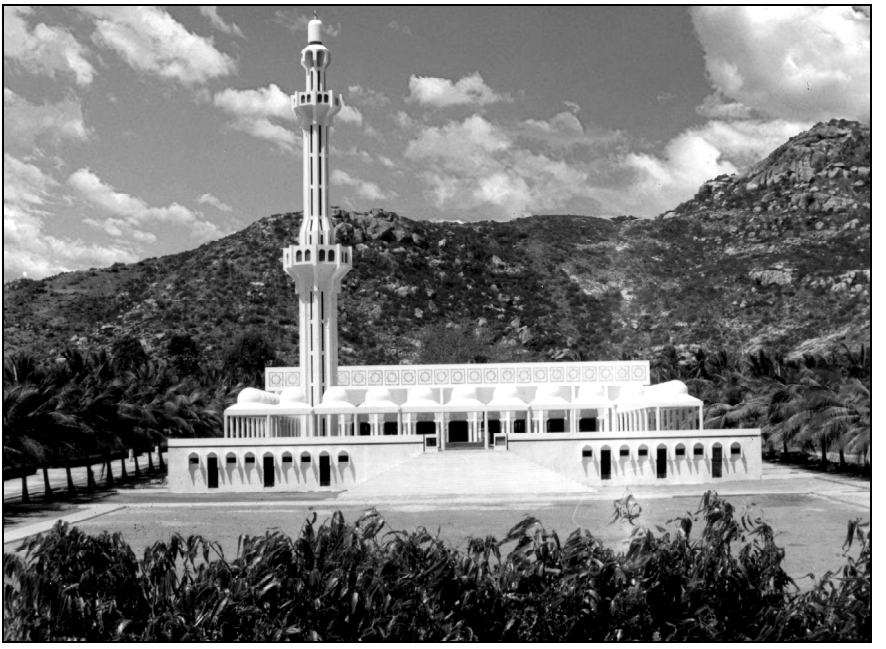

ہم لوگ نماز سے فارغ ہوکر باہر آئے تو ہر طرف فطرت (nature) کا ماحول تھا۔ جامعہ دارالسلام اِس طرح بنایا گیا ہے کہ اس کے اندر ہر طرف سرسبز درخت دکھائی دیتے ہیں۔ جامعہ کی تعمیر دراصل ایک وادی (valley) میں ہوئی ہے۔ اس کے بیرونی حصے میں دور تک پہاڑ دکھائی دیتے ہیں۔ جامعہ کے مغرب میں جو پہاڑی سلسلہ ہے، وہ وہی ہے جس کو ''کیلاش گری'' کہا جاتا ہے۔

جامعہ میں قیام کے دوران ہر وقت علماء کا ساتھ ہوتا تھا۔ اِس واک کے دوران بھی کئی علماء ہمارے ساتھ تھے۔ میں نے کہا کہ جامعہ کا یہ خوش منظر جائے وقوع دیکھ کر مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے بہت پہلے ماہ نامہ الرسالہ میں ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اس کا عنوان تھا— فطرت کی آغوش میں۔

اِس مضمون میں میں نے لکھا تھا کہ میری تمناؤں میں سے ایک تمنا یہ ہے کہ فطرت کے مناظر کے درمیان ایک دینی مرکز بنایا جائے۔ یہ مرکز گویا کہ ہمارے افکار کا ایک عملی مظاہرہ ہوگا۔ یہاں جب خدا کی عظمت بیان کی جائے گی تو درخت اور پہاڑ اور آسمان اس کی عملی تصدیق کررہے ہوں گے، اور چڑیاں اپنے چہچہے کے ساتھ اس کی ہم آواز بنی ہوئی ہوں گی۔ اب جامعہ دارالسلام کو دیکھنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا خواب یہاں واقعہ بن چکا ہے۔ کیوں کہ جامعہ کا مقصد بھی تقریباً وہی ہے جس کو میں نے نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے اپنا مشن بنا رکھا ہے، یعنی دعوت الی اللہ کا مشن۔ ہماری اِس واک کے دوران دوسرے علماءِ جامعہ کے علاوہ، جامعہ دارالسلام کے دونوں بڑے ذمے دار بھی موجود تھے— مولانا کاکا سعید احمد عمری، اور مولانا کاکا انیس احمد عمری۔

واک کرنے کے دوران میں نے ایک بات یہ کہی کہ یہاں آکر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جامعہ دارالسلام دوسرے مدارس کے مقابلے میں ایک استثنا (exception) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی کچھ منفرد خصوصیات ہیں۔ مثلاً یہاں کی مسجد میں اکثر اوقات طلبا امامت کرتے ہیں۔ ہر نماز ایک الگ طالب علم پڑھاتا ہے۔ ایسا اِس لیے کیا جاتا ہے، تاکہ طلبا کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ تعلیم کے دوران تربیت بھی حاصل کرتے رہیں۔

مارننگ واک (morning walk) کے بعد ہم لوگ لائبریری کی عمارت کے باہر کھلی فضا میں

بیٹھ گئے۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ یہاں مولانا کاکا سعید احمد عمری اور مولانا ریاض موسیٰ مالاباری کے علاوہ جامعہ کے اساتذہ اور کئی دیگر علماء موجود تھے۔ دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک صاحب نے یہ سوال کیا کہ مدارس کے ذمے داران اکثر یہ شکایت کرتے ہیں کہ اِن مدارس کے ذریعے تعلیم کا مقصد تو حاصل ہوا، لیکن افراد سازی کا مقصد بہت کم حاصل ہوسکا۔

میں نے کہا کہ اِس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی شخصیت اس کے شاکلہ (17:84) کے مطابق بنتی ہے۔ شاکلہ سے مراد ذہنی سانچہ (mindset) ہے۔ ہمارے مدارس کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں کا پورا ماحول قدیم شاکلہ پر مبنی ہوتا ہے، جب کہ موجودہ زمانے میں حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ طلبا کو لسانِ عصر میں مخاطب کیا جائے، ورنہ ان کا مائنڈ ایڈریس نہ ہوگا۔ یہی وہ کمی ہے جس کی بنا پر ایسا ہوا ہے کہ تعلیم دین کے کافی پھیلاؤ کے باوجود ایسے افراد پیدا نہیں ہو رہے ہیں جو جدید معیار پر اسلامی ذہن کے حامل ہوں اور جدید انسان کے سامنے موثر انداز میں اسلام کی نمائندگی کرسکیں۔

میں نے کہا کہ الرسالہ مشن دراصل اِسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے شروع کیا گیا۔ غالباً یہ کہنا درست ہوگا کہ پوری مسلم دنیا میں یہ واحد مشن ہے جو اِس فکری ضرورت کو پورا کر رہا ہے۔ 1959 میں ایک مشہور ہندستانی عالم کی ایک کتاب چھپی۔ اس کا ٹائٹل یہ تھا: **ردّة ولا أبا بكر لها**۔ میں نے اِس معاملے کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ جدید انسان کا کیس ذہنی ارتداد (intellectual apostasy) کا کیس نہیں ہے، بلکہ وہ ذہنی عدم اطمینان (intellectual dissatisfaction) کا کیس ہے۔ الرسالہ مشن کے تحت 1976 سے اِس بنیاد پر کام شروع کیا گیا ہے اور اب اللہ کے فضل سے ہر جگہ اس کے مثبت اثرات سامنے آرہے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں نے آپ کی کچھ کتابیں پڑھی ہیں۔ مگر اس میں تعقل پسندی بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ اِس کی کوئی مثال دیجئے، مگر وہ کوئی مثال نہ بتا سکے۔ میں نے کہا کہ جب تک آدمی کے پاس کوئی متعین مثال نہ ہو، اُس وقت تک اِس طرح کا تبصرہ کرنا آدمی کے لیے سرے سے جائز ہی نہیں۔ پھر میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ آپ جیسے لوگ دو چیزوں میں فرق

نہیں کر پاتے۔ ایک ہے تعقل پسندی اور دوسری چیز ہے اسلوب جدید۔ معروف معنی میں، میں ہرگز تعقل پسند نہیں ہوں، البتہ میری تحریروں میں جدید اسلوب ہوتا ہے۔ آپ جیسے لوگ دونوں میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ میں ایک تعقل پسند انسان ہوں۔ حالاں کہ مجرد تعقل پسندی ایک غیر مطلوب چیز ہے اور اسلوب جدید بلاشبہہ عین مطلوب کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں نے کہا کہ عقل کے استعمال کی دو صورتیں ہیں— ایک یہ کہ عقل کو بذاتِ خود صحیح اور غلط کا معیار سمجھا جائے۔ دوسرے یہ کہ نقلی (traditional) طور پر ایک ثابت شدہ بات کی مزید تائید کے لیے عقل کا استعمال کیا جائے۔ عقل کا اِس طرح تائیدی استعمال خود قرآن سے ثابت ہے۔ مثال کے طور پر جدید عقل پسند انسان یہ کہتا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان ہر اعتبار سے کامل مساوات ہونا چاہیے۔ میں اِس عقلی نقطۂ نظر کو نہیں مانتا۔ اِس کے بجائے میں قرآن کے نقطۂ نظر کو مانتا ہوں جس میں عورت اور مرد کے درمیان فطری فرق کی بنا پر ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی کو معتبر قرار دیا گیا ہے (2:282)۔ قرآن کے اِس نقطۂ نظر کی تائید کے لیے میں نے ایک سائنسی دلیل دی ہے۔ وہ یہ کہ عورت اور مرد کے دماغ میں فطری بناوٹ کے اعتبار سے ایک ناقابلِ تغیر فرق پایا جاتا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ مرد پیدائشی طور پر سنگل ٹریک مائنڈ (single track mind) کا حامل ہوتا ہے، اور اس کے مقابلے میں عورت فطری طور پر ملٹی ٹریک مائنڈ (multi track mind) رکھتی ہے۔ اس کی تفصیل آپ ماہ نامہ الرسالہ (اپریل 2006، صفحہ 7) میں دیکھ سکتے ہیں۔

8 جون 2010 کی صبح کو جامعہ کے کُلّیہ ہال میں ایک بڑا پروگرام ہوا۔ یہ یہاں کے زمانۂ قیام کا پہلا پروگرام تھا۔ اس میں جامعہ کے شعبہ ''تعارف اسلام'' کے دُعاۃ، طلبا اور جامعہ کے اساتذہ شریک ہوئے۔ اِس پروگرام کو کنڈکٹ کرنے کا کام جامعہ کے ایک نوجوان استاد مولانا عبدالعظیم مدنی نے انجام دیا۔ یہ ایک گھنٹے کا پروگرام تھا۔ اس کا عنوان یہ تھا:

دعوت الی اللہ اور اس کے تقاضے

یہاں میں نے دعوت الی اللہ کے موضوع پر کچھ باتیں کہیں۔ اس کے بعد میں نے اس

پروگرام میں جو مزید باتیں کہیں، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ جامعہ سے میرا ایک فطری تعلق رہا ہے۔ جامعہ دارالسلام 1924 میں قائم ہوا، اور یہی وہ سال ہے جب کہ میری پیدائش ہوئی۔ جامعہ سے اِسی بلا اعلان تعلق کی بنا پر ایسا ہوا کہ میں نے اپنے پہلے فرزند ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کو 1957 میں تعلیم کے لیے یہاں بھیجا۔ جامعہ کے لیے میرا پہلا سفر 1977 میں ہوا۔ یہ سفر جامعہ کی دعوت پر 18-16 اپریل 1977 کو اس کی گولڈن جُبلی (المهرجان الذهبی) میں شرکت کے لیے ہوا۔ اِس موقع پر میں نے ایک مقالہ پیش کیا تھا جو ماہ نامہ الرسالہ، جولائی 1977، میں شائع ہوا۔ اِس مقالے کا عنوان یہ تھا:

دعوت اسلامی کے جدید امکانات

بعد کو یہ مقالہ عربی زبان میں ''امکانات جدیدة للدعوة'' کے نام سے پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا گیا۔ یہ مقالہ 36 صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کو قاہرہ سے المختار الإسلامی پبلشر نے پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا تھا۔ اب وہ مقالہ راقم الحروف کی کتاب ''ظہور اسلام'' میں ''اسلامی انقلاب: تاریخِ انسانی کے لیے نیا موڑ'' کے عنوان سے شامل ہے (صفحہ 145)۔ اس سفر کی مختصر روداد اُسی زمانے میں ماہ نامہ الرسالہ، اگست 1977 میں چھپی تھی (صفحہ 52)۔

جامعہ دارالسلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں آغاز ہی سے دعوت کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس کا باقاعدہ آغاز 1978 میں ہوا، جب کہ یہاں تخصص فی الدعوۃ کے تحت، دعوت کا ایک مستقل شعبہ کھلا اور اس کے لیے ایک علاحدہ عمارت بنائی گئی جو اب بھی قائم ہے۔ یہ ایک سالہ کورس ہے اور اِس میں مدارسِ عربیہ سے فارغ حضرات کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ اِس دعوتی شعبہ کے قیام میں مولانا ریاض موسیٰ مالاباری (کیرالا) کا خاص رول ہے۔ یہاں 1997 سے ریاض موسیٰ مالاباری صاحب کی شرکت سے دعوت کا باقاعدہ کورس شروع کیا گیا۔

صبح کے اس پہلے پروگرام کے بعد دوسرا پروگرام لائبریری کے ہال میں تھا۔ یہ ایک گھنٹے کا پروگرام تھا۔ یہ پروگرام جامعہ کے اساتذہ کے لیے خاص تھا۔ اِس میں جامعہ کے تمام اساتذہ شریک تھے۔ اساتذہ کے اِس اجتماع میں گفتگو کا موضوع ''تعلق مع اللہ'' تھا۔ اِس موقع پر میں

نے جو باتیں کہیں، اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ تعلق باللہ کا مطلب ہے — ذکر اللہ، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: **کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یذکر اللہ علی کلّ أحیانہ (صحیح البخاری)**، یعنی ہر حین (occasion) کو پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بنا کر اللہ کو یاد کرنا۔ میں نے کہا کہ تعلق باللہ ایک مسلسل عمل کا نام ہے جو تدبر اور تفکر اور توسم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ ذکر اللہ کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ذکرِ کثیر ورِدِ کثیر کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ تفکرِ کثیر کا نام ہے۔

آخر میں سامعین کی طرف سے مختلف سوالات کئے گئے۔ ایک سوال یہ تھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے آج اپنی صبح کی تقریر میں موثر دعوت کے لیے صبر کی اہمیت بتائی تھی اور یہ واقعہ بیان کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک بدو مدینہ آیا اور اس نے مسجد نبوی کو گندا کر دیا۔ آپ نے اُس سے درگزر کا معاملہ فرمایا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اُس بدو نے نادانی میں ایسا کیا تھا، مگر آج مسلمانوں کے خلاف اِس قسم کے واقعات عداوت کی بنیاد پر ہو رہے ہیں، پھر اس سے کیسے درگزر کیا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا اِس سوال کا جواب صبح کے اجتماع میں قاری صاحب نے اپنی تلاوت کے ذریعہ دے دیا ہے۔ انھوں نے قرآن کی یہ آیت پڑھی تھی: **ادفع بالتی ھی أحسن، فإذا الذي بینك وبینہ عداوۃ کأنہ ولی حمیم** (41:34)۔ اِس آیت کے مطابق ہم کو ''عدو'' کے ساتھ بھی وہی حسنِ سلوک کرنا ہے جو نادان کے ساتھ کیا جاتا ہے، یعنی ردعمل کا طریقہ اپنانے کے بجائے صابرانہ طریقہ اپنانا۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ مسلمانوں کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں، مسلمان تو مسلسل صبر ہی کر رہے ہیں، لیکن اُنھیں صبر کا کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے، وہ برابر ذلت و ناکامی کا شکار ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: **إنّ اللہ مع الصابرین**۔ یہ آیت اِس بات کا ثبوت ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان مطلوب صبر نہیں کر رہے ہیں۔ اگر وہ مطلوب صبر کر رہے ہوتے تو قرآن کے بیان کے مطابق، یقیناً وہ ''ذلت و ناکامی'' کا شکار نہ ہوتے۔ کیوں کہ قرآن کے مطابق، صبر کرنے والوں کو اللہ کی نصرت حاصل ہوتی ہے، اور اللہ کی نصرت

کے بعد کسی کے لیے ذلت و ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔

صبر کا مطلب کیا ہے۔ صبر کا مطلب نہ پسپائی ہے اور نہ بے عملی ہے۔ صبر دراصل یہ ہے کہ آدمی ٹکراؤ کو اوائڈ کر کے مثبت بنیاد پر اپنے عمل کا منصوبہ بنائے۔ صبر یہ ہے کہ آپ اپنے دل سے نفرت کو ختم کر دیں، تشدد کے مزاج کو ختم کر دیں، لڑنے کے مزاج کو ختم کر دیں، اشتعال سے پرہیز کریں۔ اِس طرح کے مثبت اوصاف کو پیدا کرنے کے بعد جو تعمیری منصوبہ بنایا جائے، اسی کا نام صبر ہے۔

پروگرام کے بعد مولانا کا کا سعید احمد عمری نے کہا کہ آپ نے بے حد قیمتی باتیں بتائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ تقریر کے اختتام پر اساتذہ کو ہمارے یہاں کا چھپا ہوا لٹریچر دیا گیا۔ ہال میں میز پر موجود سارا لٹریچر اُسی وقت ختم ہو گیا۔ اساتذہ نے خود سے یہ لٹریچر حاصل کیا، اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

8 جون 2010 کے مذکورہ پروگرام کے بعد میرے کمرے میں کئی لوگ ملاقات کے لیے آئے۔ یہ بنگلور کے رہنے والے تھے۔ ان میں ایک صاحب کا نام مسٹر رمن تھا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ایک اسکول میں انگلش ٹیچر ہیں۔ مسٹر رمن نے بتایا کہ مجھے خدا کی توفیق سے، آپ کی کتاب (The Reality of Life) پڑھ کر سچائی کی دریافت ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میں ایک متلاشی (seeker) تھا۔ میں نے اِس سلسلے میں مختلف مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کیا، مگر میں اپنی تلاش کا جواب پانے میں ناکام رہا۔ اب آپ کی کتابوں کے مطالعے کے بعد توحید کا تصور پوری طرح مجھ پر واضح ہو گیا ہے، اور جنت کا راستہ میرے سامنے کھل گیا ہے۔

8 جون 2010 کی سہ پہر کو تین بجے سے چار بجے تک دُعاۃ کے ساتھ ''تبادلۂ خیال'' کا پروگرام تھا۔ میں نے پروگرام کے آغاز میں تقریباً 25 منٹ تک دعوت کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا۔ ایک بات میں نے یہ کہی کہ دعوت کا عمل ایک اعتبار سے دو طرفہ ایکسچینج (exchange) کا عمل ہے۔ دعوت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دوسروں کے سامنے ایک بات کا اعلان کر دیں، بلکہ دعوت کے دوران آپ کو خود بھی سیکھنا چاہیے۔ دعوتی عمل کا فائدہ خود داعی کو

ذہنی ارتقا کی صورت میں ملنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ مطالعہ کتب کو اپنے ڈیلی رُٹین میں شامل کرلیں۔ اِسی کے ساتھ آپ میں سے ہر شخص ڈائری بھی ضرور رکھے۔ ڈائری گویا کہ کتابِ محاسبہ ہے۔ دُعاۃ کو ایک اور مشورہ میں نے یہ دیا کہ آپ لوگ اپنا دعوتی عمل خاص طور پر اُن لوگوں کے ساتھ کریں جن سے آپ کی علمی سطح بڑھنے والی ہو— دینا وہی دینا ہے جب کہ دینے کے عمل کے دوران آدمی نے خود بھی کچھ پایا ہو۔

تقریر کے بعد سوال و جواب کا پروگرام ہوا۔ ایک سوال یہ تھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ میں گزشتہ ایک سال سے ماہ نامہ الرسالہ اور آپ کی دیگر کتابوں کا مطالعہ کررہا ہوں۔ مطالعے کے دوران میں نے پایا کہ آپ ذہنی ارتقاء پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ میں نے کہا کہ ذہنی ارتقا اپنی حقیقت کے اعتبار سے، عین وہی چیز ہے جس کو قرآن میں ''ازدیادِ ایمان'' کہا گیا ہے۔ لوگ ازدیادِ ایمان کو ایک پراسرار چیز سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ازدیادِ ایمان ایک معلوم چیز ہے اور اس کا تعلق انسانی دماغ سے ہے۔ وہ غور وفکر کے ذریعے حاصل ہوتا ہے جس کو قرآن میں تدبر وتفکر اور توسم کہا گیا ہے۔ وہ چیز جس کو قربِ الٰہی کہا جاتا ہے، اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ یہی ذہنی ارتقا ہے۔ ذہنی ارتقا سے آدمی کو معرفت حاصل ہوتی ہے، اور معرفت انسان کو اللہ سے قریب کرنے والی ہے۔

8 جون 2010 کو عصر کی نماز کے بعد جامعہ دارالسلام کی مسجد میں ایک خطاب رکھا گیا۔ اِس میں جامعہ کے طلبا اور اساتذہ دونوں شریک تھے۔ اِس خطاب کا موضوع تھا: معرفتِ الٰہی۔

میں نے کہا کہ معرفت کیا ہے۔ معرفت یہ ہے کہ انسان حالتِ غیب میں اپنے رب کو پہچانے، وہ دیکھے بغیر اس کو دیکھ لے۔ معرفت دراصل یہ ہے کہ آدمی کو خدا کی موجودگی (presence of God) کا حسّیاتی تجربہ ہونے لگے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں **واسجد واقترب** کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، اور حدیث میں اس کے لیے یہ الفاظ آئے ہیں: **تعبد الله كأنك تراه**۔

ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے اور معرفت کے حصول کی بھی ایک قیمت ہے، وہ قیمت بنیادی طور پر یہ ہے کہ آدمی پردۂ التباس (element of doubt) کو پھاڑ کر حقیقت اعلیٰ کو دیکھ

سکے۔ پردہ التباس کو پھاڑنے میں وہی شخص کامیاب ہوسکتا ہے جو اپنے آپ کو ہر قسم کے ڈسٹریکشن (distraction) سے بچائے، جو اپنے آپ کو کامل یکسوئی کے ساتھ معرفت کے حصول میں لگا دے۔ ڈسٹریکشن میں ہر وہ چیز شامل ہے جو آدمی کی توجہ کو مقصدِ اعلیٰ سے ہٹانے والی نہ ہو۔ اِس میں ہر قسم کے منفی جذبات بھی شامل ہیں۔ مثلاً نفرت، تعصب، فخر، احساسِ برتری، اور خواہش کی پیروی، وغیرہ۔

اِس سلسلے میں ایک بات میں نے یہ بتائی کہ انسان کو جو دماغ دیا گیا ہے، وہ بے پناہ صلاحیتوں کا حامل ہے، وہ کوئی عبث چیز نہیں ہے۔ وہ اِس لیے ہے کہ آدمی اپنے دماغ کو اَن فولڈ (unfold) کرے اور اس کو حقائقِ ربانی کی دریافت کے لیے استعمال کرے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ کلماتِ رب (31:27) اتنے زیادہ ہیں جن کی کوئی حد نہیں۔ اِسی کے ساتھ انسانی دماغ کے جو امکانات (potential) ہیں، وہ بھی لامحدود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک فرد کے دماغ میں جتنے پارٹکل ہوتے ہیں، وہ پوری کائنات میں موجود پارٹکل کے برابر ہیں۔ انسان کو یہ غیر معمولی صلاحیت اِس لیے دی گئی ہے کہ وہ اس کو استعمال کرکے معرفتِ اعلیٰ کو حاصل کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنت میں اہلِ جنت کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ (شغلِ فاکہ) یہ ہوگا کہ وہ لامحدود کلماتِ رب کو ابدی طور پر دریافت کرتے رہیں۔ موجودہ دنیا دراصل اِس لیے ہے کہ آدمی اپنے آپ کو جنت کے اِس لامحدود عمل کے لیے تیار (prepare) کرے۔ جنت کی سب سے بڑی خوشی حصول معرفت کی خوشی ہے۔ حصولِ معرفت کا یہ سفر جنت میں ابدی طور پر جاری رہے گا۔ اس کے علاوہ، جنت میں جو مادی نعمتیں ملیں گی، وہ دراصل ضیافتِ ربّانی کے طور پر ملیں گی یہی وہ بات ہے جو قرآن میں اِن الفاظ میں کہی گئی ہے: نزلاً من غفورٌ رحیم۔

خطاب کے بعد سوال و جواب کا پروگرام تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ حصول معرفت کی نسبت سے قدیم روایتی دور اور جدید سائنسی دور میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ معرفت کا اصل ذریعہ تخلیقاتِ خداوندی میں تدبر اور تفکر ہے۔ یہی علماء راسخین کا مسلک ہے۔

امام ابن تیمیہ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ کائنات میں پھیلی ہوئی خدائی نشانیوں پر غور و فکر کرنا ہی

وہ چیز ہے جس کے ذریعے آدمی اللہ تعالیٰ کی حقیقی معرفت حاصل کرتا ہے: **أن التفكير في الآلاء والنعم يمكن للعقل أن يستنبط فيها عظمةَ الصانع وحكمته وما يليق به من صفات الكمال والجلال، فيعرفه حق معرفته۔** (**دقائق التفسير، الجامع لتفسير ابن تيمية،** 1/49)

یہ تدبر اور تفکر قدیم زمانے میں بھی مطلوب تھا، اور آج بھی اسی کے ذریعے کسی آدمی کو معرفتِ خداوندی مل سکتی ہے۔ اِس اعتبار سے، قدیم دور اور جدید دور میں کوئی فرق نہیں، البتہ جدید سائنسی دور میں معلومات کے اضافے کی بنا پر تدبر کا فریم ورک (frame work) بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔

پروگرام ختم ہوا تو مغرب کی نماز میں تقریباً نصف گھنٹہ باقی تھا۔ ہم لوگ کچھ دیر کے لیے کلیہ بلڈنگ کے دفتر میں بیٹھ گئے۔ یہاں جامعہ کے مختلف اساتذہ اور دیگر علماء موجود تھے۔ مولانا سید اقبال احمد عمری نے کہا کہ آج کی تقریر (معرفتِ الٰہی) میں آپ نے جنت اور کلماتِ رب کے بارے میں جو کچھ کہا، اُس سے جنت اور آخرت کی معنویت پوری طرح کھل گئی۔ میں نے کہا کہ جنت کا یہ تصور اُس سوال کا واحد جواب ہے جو تمام اہلِ علم کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ تمام فلاسفہ اور مفکرین اور سائنس داں مشترک طور پر اس مسئلے سے دوچار ہیں کہ اتنی زیادہ بامعنی (meaningful) کائنات کیا ایک بے معنی انجام (meaningless end) پر ختم ہوجائے گی۔ جنت کا تصور واحد تصور ہے جو اِس سوال کا جواب فراہم کرتا ہے۔ لیکن جنت کے ماننے والوں نے جنت کی جو تصویر بنا رکھی ہے، اُس میں اُنھیں اپنے اِس سوال کا جواب نہیں ملتا۔

8 جون 2010 کو مغرب کی نماز کے بعد ہم لوگ اپنے کمرے میں آ گئے۔ یہاں مولانا ریاض موسیٰ مالاباری سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ہمارے انگریزی ترجمہ قرآن کو سامنے رکھ کر ملیالم زبان میں اس کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اِس کے علاوہ، وہ ہماری کتاب ''تعبیر کی غلطی'' کا ملیالم ترجمہ شائع کر رہے ہیں۔ ان کی مادری زبان ملیالم ہے۔ انھوں نے میرے حالات اور مشن کو لے کر ایک تفصیلی انٹرویو لیا جس کو وہ ملیالم اخبار میں شائع کریں گے۔

آج شام کو مولانا کا کا سعید احمد عمری سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے تزکیہ اور روحانیت کے

مسئلے پر تفصیلی گفتگو کی۔ یہ گفتگو تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ بعد کو اِس مجلس میں دیگر علماء کے علاوہ، مولانا فیاض الدین عمری اور مولانا سید اقبال احمد عمری، وغیرہ آ گئے۔ کاکا صاحب اپنے مزاج کے اعتبار سے بہت صاف دل آدمی ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اِس مجلس میں مولانا فیاض الدین عمری نے مجھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں نے پایا ہے کہ کاکا صاحب کا سب سے بڑا کنسرن (concern) یہ ہے کہ جامعہ دارالسلام کے طلبا اور اساتذہ میں تزکیہ اور روحانیت پیدا ہو۔ یہ بات سن کر کاکا صاحب فوراً سنجیدہ ہو گئے اور انھوں نے کہا کہ آپ لوگ غلط بات کیوں کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ کہیے کہ خود مجھے تزکیہ اور روحانیت کی ضرورت ہے۔

8 جون 2010 کو ہم نے عشاء کی نماز عمر آباد کی مسجد میں ادا کی۔ نماز کے بعد جامعہ کے ایک سینئر استاذ اور سابق شیخ الحدیث مولانا ظہیر الدین اثری رحمانی صاحب کے گھر پر کھانے کا پروگرام تھا۔ وہ جامعہ کیمپس کے باہر عمر آباد میں رہتے ہیں۔ وہ 1920 میں (اعظم گڑھ، یوپی) میں پیدا ہوئے اور بعد کو عمر آباد میں آ کر بس گئے۔ وہ 1958 سے مستقل طور پر عمر آباد میں مقیم ہیں۔ گذشتہ 50 سال سے وہ جامعہ میں حدیث کے استاذ ہیں اور اِسی کے ساتھ افتاء کا کام بھی کرتے رہے ہیں۔ اپریل 1977 میں انھیں کی خصوصی دعوت اور تحریک پر میں نے جامعہ دارالسلام کا سفر کیا تھا۔

عمر آباد آنے سے پہلے میں نے یہ کہہ دیا تھا کہ میں کسی کے گھر دعوتی کھانا کھانے کے لیے نہیں جاؤں گا۔ میں صرف جامعہ میں کھانا کھاؤں گا۔ مگر بعض وجوہ سے استثنائی طور پر مولانا ظہیر الدین صاحب کے یہاں کھانے کے لیے جانا منظور کر لیا۔ اِس موقع پر جامعہ کے کئی علماء بھی شریک تھے۔ یہاں جو باتیں ہوئیں، اُن میں سے ایک یہ تھی کہ میں نے ذکر کی وضاحت کی۔ میں نے کہا کہ ذکر سب سے بڑی ہستی کو یاد کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اِس لیے ذاکر کے اندر اُسی عظیم ہستی کی نسبت سے کیفیات پیدا ہونی چاہئیں۔ جس ذکر میں ذاکر کے اندر ربانی کیفیات پیدا نہ ہوں، وہ ذکر ایسا ہی ہے جیسے پلاسٹک کا بنا ہوا گلاب کا پھول۔ بظاہر وہ پھول ہے، لیکن اس سے آدمی کو کوئی خوشبو نہیں ملتی۔ ایک حقیقی پھول آدمی کو اپنی خوشبو سے معطر کر دیتا ہے۔ اِسی طرح حقیقی ذکر وہ ہے

جوآدمی کواعلیٰ ربانی کیفیات سے معمور کردے۔

9 جون 2010 کی صبح کو نمازِ فجر کے بعد کچھ دیر ہم لوگوں نے جامعہ کے کمپس میں واک کی۔ اِس کے بعد مولانا سید اقبال احمد عمری نے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں کچھ دیر کے لیے ان کے گھر جاؤں اور وہاں صبح کی چاہیے پیوں۔ میں نے کہا کہ عام طور پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ چائے پر بلاتے ہیں اور پھر پرتکلف ناشتے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اگر آپ یہ وعدہ کریں کہ آپ کے یہاں صرف چائے ہوگی اور دوسرا کوئی بھی آئٹم نہ ہوگا، تو میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔ انھوں نے وعدہ کیا۔ چناں چہ میں ان کے یہاں گیا اور واقعۃً انھوں نے اپنے وعدے کو نبھایا۔

اِس مجلس میں اور بھی کئی علماء موجود تھے — مولانا محمد ابراہیم عمری، مولانا کا کا انیس احمد عمری، وغیرہ۔ یہاں جو باتیں ہوئی، اُن میں سے ایک یہ تھی۔ میں نے کہا کہ آج کل تسبیح فاطمہ کا بہت رواج ہے۔ لیکن یہ لوگ تسبیح فاطمہ کو اس کی پوری شکل میں نہیں لیتے، بلکہ ادھوری شکل میں لیتے ہیں۔ جیسا کہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تسبیح اپنی صاحب زادی فاطمہ کو خادم کے بدل کے طور پر بتائی تھی۔ مگر آج کل لوگوں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے تسبیح فاطمہ کو اس کے پس منظر سے الگ کرلیا ہے اور وہ اس کو پراسرار فضیلت کے طور پر پڑھتے ہیں، حتی کہ اس کی بنیاد پر تسبیح کا بہت بڑا کاروبار ساری مسلم دنیا میں قائم ہے۔ مزید یہ کہ پہلے وہ اپنی صاحب زادیوں کے لیے ہر قسم کی مادّی سہولت فراہم کرتے ہیں اور پھر تبرک کے طور پر ان کو تسبیح اور مصلی بھی دے دیتے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کی بعض باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ذکر کے فارم کا انکار کرتے ہیں، حالاں کہ ذکر کا فارم تو قرآن میں موجود ہے۔ میں نے کہا کہ یہ اعتراض محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذکر الفاظ کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کسی بھی چیز کا تصور کرنے کے لیے الفاظ کا محتاج ہے۔ اِسی طرح ذکر کے لیے بھی الفاظ ضروری ہیں۔ میں دراصل ذکر کی موجودہ شکل کو ذکر کا تصغیری فارم سمجھتا ہوں، جس میں ذکر کو اس کی اسپرٹ سے الگ کردیا گیا ہے۔

ذکر کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے قرآن کی اِس آیت کا مطالعہ کیجئے: **إنما المؤمنون الذين**

إذا ذُكر الله وجلت قلوبهم (8:2)۔قرآن کی اِس آیت کے مطابق، ذکر وہ ہے جو اگرچہ الفاظ کی صورت میں ظاہر ہو، لیکن اپنی داخلی کیفیت کے اعتبار سے وہ ایک ہلچل کی مانند ہو، جس سے ذاکر کا قلب دہل اٹھے، جو اس کے دل و دماغ کے لیے ایک طوفانی تجربہ بن جائے، جو آدمی کے لیے خداوند ذوالجلال کی دریافت کے ہم معنی بن جائے۔

گفتگو کے دوران کاکا انیس احمد عمری سے میں نے پوچھا کہ آپ کی فیملی ایک جوائنٹ فیملی ہے۔ جوائنٹ فیملی میں طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں آپ لوگ کس طرح اِس مسئلے کو حل کرتے ہیں۔ کاکا انیس صاحب نے کہا کہ اِس کا فارمولا ہے— صبر و برداشت سے کام لینا اور دوسروں کی کمی کو نظر انداز کرنا۔ اِس میں سب سے اہم رول گھر کے بڑے کا ہوتا ہے۔ گھر کا بڑا اگر دانش مندی سے کام لے تو کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوتا— یہ فارمولا مجھے بہت پسند آیا۔ یہ سادہ بھی ہے اور پوری طرح قابلِ عمل بھی، مگر اکثر لوگ اِس حقیقت کو نہیں جانتے۔

9 جون 2010 کا پروگرام صبح 10 بجے سے شروع ہونے والا تھا۔ اِس سے پہلے کئی علماء میرے کمرے میں آ گئے۔ اُن سے دیر تک گفتگو ہوئی۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ نے ایک مجلس میں کہا تھا کہ ذکر تجدید شعور کا نام ہے، تکرارِ لفظی کا نام ذکر نہیں، حالاں کہ احادیث میں بہت سی روایات ذکر کے سلسلے میں آئی ہیں۔ میں نے کہا کہ جو کچھ میں نے کہا تھا، اُس کا تعلق نفسِ ذکر سے نہیں ہے، بلکہ تصورِ ذکر سے ہے۔ ذکر کی اہمیت بلاشبہہ بہت زیادہ ہے، لیکن ذکر سے مراد تکرارِ معانی ہے، نہ کہ مجرد تکرارِ الفاظ۔ جب انسان اپنے خالق کو یاد کرتا ہے تو اس کے دل و دماغ میں ایک تموج پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ داخلی تموج جب الفاظ کی صورت میں ڈھل جائے تو اسی کا نام ذکر ہے۔

مجلس کے دوران مولانا کاکا سعید احمد عمری میرے کمرے میں آئے۔ اس وقت وہاں کئی اساتذہ اور دُعاۃ بیٹھے ہوئے تھے، جو اُن کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ کاکا صاحب نے ان لوگوں کو سختی کے انداز میں کھڑے ہونے سے منع کیا اور کہا کہ آپ لوگ جیسے بیٹھے ہیں، اِسی طرح بیٹھے رہیں، اٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اِس کے بعد کاکا صاحب خاموشی کے ساتھ کمرے کے ایک طرف خالی جگہ دیکھ کر

بیٹھ گئے — یہ منظر میں نے صرف جامعہ دارالسلام میں دیکھا۔

9 جون 2010 کو ''تزکیۂ نفس'' کے موضوع پر خطاب کرنا تھا۔ اِس خطاب کا انتظام جامعہ کی لائبریری کے ہال میں کیا گیا تھا۔ اِس خطاب میں جو باتیں میں نے کہیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ عام طور پر تزکیۂ نفس کے موضوع کو ایک پراسرار موضوع سمجھا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تزکیہ نفس کو تزکیۂ قلب کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ حالاں کہ صحیح یہ ہے کہ تزکیہ نفس سے مراد تزکیہ ذہن ہے، یعنی نفسیاتی تزکیہ۔ تزکیہ نفس کو دوسرے لفظوں میں تعمیرِ شخصیت کہا جاسکتا ہے، یعنی روحِ انسانی کی تطہیر (purification of soul)۔ تزکیہ نفس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنا بے رحمانہ محاسبہ کرے اور اپنی شخصیت کو تمام منفی اور نامطلوب عناصر سے پاک کرکے اپنے آپ کو ربانی انسان بنائے۔ تزکیہ نفس کوئی وقتی عمل نہیں، وہ تاحیات جاری رہنے والا ایک مسلسل عمل ہے۔

تزکیہ نفس کا کوئی تعلق مروّجہ مراقبہ (meditation) سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق تمام تر تفکر اور تدبر سے ہے۔ علامہ ابن تیمیہ (وفات: 728ھ) نے بجا طور پر لکھا ہے کہ تزکیہ نفس کا ذریعہ تذکر اور تفکر ہے: **أن التذكر والتفكر سبب التزكي. فإنّه إذا تذكر خاف ورجا، فتزكى** (**دقائق التفسير للإمام ابن تيمية**، 5/92)

تزکیہ نفس دراصل یہ ہے کہ محاسبہ (introspection) کے ذریعے اپنی کنڈیشننگ کو توڑا جائے۔ اپنے ذہن کی ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) کی جائے۔ دراصل ڈی کنڈیشننگ ہی تزکیہ نفس کا پہلا دروازہ ہے۔ ہر آدمی کا کیس کنڈیشننگ کا کیس ہے۔ جب تک اِس کنڈیشننگ کو توڑا نہ جائے، کسی شخص کے اندر تزکیہ نفس کا عمل (process) شروع نہیں ہوسکتا۔

میں نے کہا کہ لوگ تزکیہ کا معروف کورس پورا کرتے ہیں، لیکن ان کے اندر مطلوب تزکیہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تزکیہ کے نام پر لوگ ورد اور تسبیح اور وظیفہ اور نفلی اعمال کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اِن اعمال کے اندر کراماتی اوصاف چھپے ہوئے ہیں جو پراسرار طور پر ان کا تزکیہ کردیں گے، حالاں کہ اِس طرح کے شکلی اعمال کا براہِ راست تعلق تزکیہ نفس سے نہیں ہے۔ تزکیہ حقیقۃً

ایک شعوری عمل کا نتیجہ ہے، نہ کہ صرف کسی فارم کی ظاہری ادائیگی کا نتیجہ۔

خطاب کے بعد سوال وجواب کا پروگرام تھا۔ یہ ایک گھنٹے کا سوال و جواب تھا۔ یہاں جو سوالات کئے گئے، ان میں سے ایک سوال تھا کہ آپ نے اپنی تقریر میں بتایا کہ تزکیہ نفس کا تعلق کسی ظاہری فارم سے نہیں ہے، بلکہ تزکیہ ایک شعوری عمل کا نام ہے۔ اِس کی وضاحت فرمائیں۔ میں نے کہا کہ اِس سوال کا جواب ایک صحابی کے عمل سے معلوم ہوتا ہے۔ حضرت ابوالدرداء انصاری کی وفات کے بعد ان کی اہلیہ ام الدرداء سے پوچھا گیا کہ ابوالدرداء کا خاص عبادتی عمل کیا تھا۔ انھوں نے جواب دیا: **التفکر والاعتبار** یعنی سوچنا اور چیزوں سے عبرت پکڑنا۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے اپنے بارے میں کہا کہ میں ایک صوفی ہوں، حالاں کہ تصوف، اسلام میں ایک مبتدعانہ اضافہ ہے۔ میں نے کہا کہ میں صوفی کا لفظ مروجہ معنی میں استعمال نہیں کرتا۔ صوفی سے میری مراد وہی ہے جس کے لیے قرآن میں ربانیت (3: 79) کا لفظ آیا ہے۔ ربانیت کی اہمیت خود قرآن سے ثابت ہے، اور جہاں تک موجودہ تصوف کا تعلق ہے، وہ اِسی ربانیت کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔ تصوف کے بارے میں میرے نقطۂ نظر کو جاننے کے لیے آپ میری کتاب ''فکر اسلامی'' (صفحہ 128) کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

9 جون 2010 کو اگلا پروگرام دعاۃ سے ''تبادلۂ خیال'' کا تھا۔ یہ ایک گھنٹے کا پروگرام تھا جو تین بجے سے چار بجے تک جاری رہا۔ یہ پروگرام سوال وجواب کی صورت میں تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ اسلام کا ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق عقیدے سے ہے۔ مثلاً توحید اور آخرت، وغیرہ۔ اسی طرح کچھ چیزیں وہ ہیں جن کا تعلق نظام سے ہے۔ مثلاً دیوانی اور فوج داری کے قوانین اور تعزیرات، وغیرہ۔ ایسی حالت میں سوال یہ ہے کہ ہم اسلام کی دعوت کا آغاز اسلام کے کس حصے سے کریں۔

میں نے کہا کہ اِس سوال کا جواب سیرتِ نبوی میں موجود ہے۔ آپ نے مکہ میں نبوت کا آغاز کیا تو آپ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ لوگوں کے پاس جاتے اور ان سے کہتے: **أیھا الناس قولوا لا إلٰہ إلاّ اللہ، تفلحوا**۔ اِسی طرح قرآن کے جو حصے مکی دور میں نازل ہوئے تھے، آپ ان کو پڑھ کر لوگوں

کوسناتے۔ چناں چہ سیرت کی کتابوں میں آپ کے بارے میں یہ آتا ہے کہ آپ لوگوں سے مل کر اُن کو اسلام کی دعوت پیش کرتے اور ان کے سامنے قرآن کے کچھ حصے پڑھ کر سناتے (**عرض عليهم الإسلام، وتلا عليهم القرآن**)۔

ایک سوال یہ تھا کہ اسلام میں سیاسی اقتدار کی حیثیت کیا ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن کے مطابق، سیاسی اقتدار ایک ثانوی (secondary) چیز (**أخرى**) کی حیثیت رکھتا ہے (61:13)۔ اسلام میں سیاسی اقتدار کو مطلوب اول کا درجہ حاصل نہیں۔

پروگرام کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ یہاں کئی علماء اکھٹا ہو گئے اور دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اِس مجلس میں ایک بات میں نے یہ کہی کہ اسلام میں عقل کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ میں نے اِس سلسلے میں حاضرین کو ایک حدیث سنائی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: **ما خلق الله خلقاً أكرم عليه من العقل (المغني عن حمل الأسفار للعراقي، رقم الحديث: 13483)** یعنی اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں پیدا کیں، اُن میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت کی حامل چیز عقل ہے۔ عجیب بات ہے کہ بعد کے لوگوں نے عقل کو غیر اہم قرار دے دیا اور ساری اہمیت عشق کو دے دی، یہاں تک کہ ایک معروف مسلم شاعر نے کہا:

عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام بولہب

یہ بلاشبہہ ایک فکری انحراف تھا۔ اِس غلطی کا سبب غالباً یہ تھا کہ بعد کے لوگوں نے عقل کو فلسفہ کی نسبت سے دیکھا۔ اگر وہ عقل کو سائنس کی نسبت سے دیکھتے تو وہ کبھی اِس غلطی میں مبتلا نہ ہوتے۔ عقل ایک فطری صلاحیت کا نام ہے جو خدا کی ایک تخلیق ہے۔ اس کے مقابلے میں، فلسفہ خود انسان کے اپنے بنائے ہوئے ایک علم کا نام ہے، جو صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ سائنس اور فلسفہ میں یہ فرق ہے کہ فلسفہ قیاسی منطق (sylogism) پر مبنی ہے، اور سائنس مکمل طور پر قوانین فطرت پر مبنی ہے۔ سائنس میں اگر کوئی غلطی ہوتی ہے تو وہ ناقص دریافت کی بنا پر ہوتی ہے، نہ کہ خود ساختہ قیاس کی بنا پر۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ قرآن کی آیت: **اتخذوا أحبارهم ورهبانهم أرباباً من**

دون اللہ (9:31) کا مطلب کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اِس آیت کی وضاحت ایک مشہور روایت سے ہوتی ہے۔ عدی بن حاتم الطائی (وفات: 68ھ) پہلے نصرانی تھے۔ وہ بعد کو اسلام میں داخل ہوگئے۔ وہ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ انھوں نے آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی اور کہا کہ یہود ونصاریٰ نے اپنے احبار ورہبان کو اپنا رب نہیں بنایا، انھوں نے کبھی اپنے احبار ورہبان کی عبادت نہیں کی (إنهم لم يعبدوهم)، آپ نے فرمایا کہ ہاں، اُن کے احبار ورہبان نے حلال کو حرام کیا اور حرام کو حلال کیا اور انھوں نے اس کو مان لیا۔ یہود ونصاری کی یہی روش ان کے احبار ورہبان کی عبادت کے ہم معنی تھی (فذلك عبادتهم إياهم)۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں رب کا لفظ آیا ہے۔ یہ اِس معاملے کی شناعت کو بتانے کے لیے ہے۔ انھوں نے جو کیا تھا، وہ یہ تھا کہ خدا اور رسول کے حوالے کے بجائے، اپنے احبار ورہبان کا حوالہ دے کر کسی چیز کو ترک کرتے یا کسی چیز کو اختیار کر لیتے۔ حدیث میں تحلیلِ حرام اور تحریمِ حلال کا لفظ بھی اِسی معاملہ کی شناعت کو بتانے کے لیے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کے لیے اپنے علماء ومشائخ (احبار ورہبان) کو مستقل بالذات مرجع (reference) سمجھ لیا۔

موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مسلمان عین اِسی روش پر قائم ہیں۔ موجودہ مسلمان عام طور پر یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ — ہمارے اکابر کا طریقہ یہ ہے، ہمارے اسلاف کا اِس پر عمل رہا ہے، ہمارے بزرگوں نے ایسا فرمایا ہے، وغیرہ۔ یہ طریقہ عین یہودی طریقہ ہے۔ مسلمان کے لیے صرف ایک ہی مستقل بالذات حوالہ ہے، اور وہ خدا اور رسول کا حوالہ ہے۔ اِس کے سوا جو حوالے مسلمانوں میں رائج ہوگئے ہیں، وہ بلاشبہہ یہودی اتباع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اکابر کا منہج، اسلاف کا منہج اور بزرگوں کا منہج، سب اِسی کی مثالیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ منہج واتباع کی حیثیت سے ہمارا سارا تعلق خدا اور رسول سے ہونا چاہیے، نہ کہ اپنے اکابر اور اپنے اسلاف سے۔

میں نے اِس مجلس میں جو باتیں کہیں، اُن میں سے ایک بات یہ تھی کہ حدیث کی کتابوں میں ایک ایسے گروہ (عصابة) کا ذکر ہے جو ہند میں غزوہ کرے گا۔ اس گروہ کے لیے حدیث میں جہنم کے

عذاب سے نجات کی خوش خبری دی گئی ہے۔ اِس حدیث میں ''غزوہ'' کے الفاظ آئے ہیں: **عصابة تغزوا الهند (صحيح الجامع للألباني، رقم الحديث: 4012)**۔ یہاں غزوہ سے مراد مسلح جنگ نہیں، بلکہ پُر امن دعوتی عمل ہے۔ میرے نزدیک، اِس حدیث میں ہند سے مراد غالباً جنوبی ہند ہے، کیوں کہ شمالی ہند کے برعکس، جنوبی ہند میں پرامن دعوتی عمل کے حالات پوری طرح موجود ہیں۔ پھر میں نے کہا جامعہ دارالسلام کے حالات معلوم ہونے کے بعد میرا احساس ہے کہ ان شاء اللہ یہی وہ ادارہ ہے جو غالباً اِس پیشین گوئی کا مصداق ہے، **واللہ أعلم بالصواب**۔ موجودہ زمانے میں بے شمار مسلم ادارے قائم ہوئے، لیکن میرے علم کے مطابق، جامعہ دارالسلام واحد ادارہ ہے جو دعوت کے تصور کے تحت قائم کیا گیا۔ جامعہ دارالسلام میں دعوت کا تصور آغاز ہی سے موجود تھا۔ 1978 میں یہاں باقاعدہ ایک مستقل ادارہ خاص دعوتی مقصد کے لئے قائم کیا گیا، جس کا نام یہ ہے: **معهد مقارنة الأديان**۔

مولانا ریاض موسیٰ مالاباری غیر مسلموں کے درمیان دعوتی کام کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے بعض ساتھیوں کے ہم راہ ہندستان کے مختلف اداروں کا دورہ کیا۔ مگر کوئی ادارہ اِس کام کے لیے تیار نہیں ہوا۔ اِس کے بعد وہ 1997 میں جامعہ دارالسلام آئے۔ یہاں کے ذمے داران فوراً ان کے ساتھ تعاون کرنے پر راضی ہوگئے۔ چناں چہ جامعہ کے تعاون سے ''ادارہ تعارف اسلام'' کے تحت یہاں دعوتی کام ایک منظّم شکل میں جاری ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ غالباً جامعہ دارالسلام کے تحت کام کرنے والے دعاۃ کا گروپ ہی ان شاء اللہ وہ عصابہ ہے جس کی پیشگی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی، **واللہ أعلم بالصواب**۔ خود مجھ کو یہ تجربہ ہوا کہ دعوتی کام کے لیے عملی طور پر جتنا زیادہ تعاون مجھ کو اِس ادارے کے تحت حاصل ہوا، اتنا زیادہ تعاون مجھے کسی بھی دوسرے ادارے سے کبھی حاصل نہیں ہوا۔ جامعہ دارالسلام آتے ہی مجھ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ دونوں ایک دوسرے کا فطری جز تھے جو باہم مل گئے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جامعہ دارالسلام 1924 میں قائم کیا گیا، اور میری پیدائش بھی عین اِسی سال ہوئی۔

آخر میں میں نے کہا کہ ''عصابہ'' کی نسبت سے جو بات میں نے کہی ہے، وہ کوئی فخر یا

فضیلت یا ادّعا کی بات نہیں ہے۔ اس عصابہ کا حقیقی علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ میں نے جو بات کہی، اس کی حیثیت صرف ایک ذمے داری کی تشخیص کی ہے۔ اِس تشخیص کا تقاضا ہے کہ آپ حضرات اب مزید یقین کے ساتھ اِس دعوتی غزوہ میں ہمہ تن سرگرمِ عمل ہو جائیں۔

9 جون 2010 کے پروگرام کے بعد عصر کی نماز مسجد میں پڑھی گئی۔ نماز سے فراغت کے بعد ہم لوگ جامعہ کے کلیہ ہال میں گئے۔ وہاں ایک خطاب کا پروگرام تھا۔ اِس کا موضوع تھا: آخرت رخی زندگی۔ یہ ایک گھنٹے کا خطاب تھا۔ میں نے کہا کہ آخرت رخی زندگی کا فارمولا حدیث کے مطابق، یہ ہے: **حاسبوا أنفسكم قبل أن تحاسبوا، وزنوا أنفسكم قبل أن توزنوا (مسند الفاروق 2/618)**۔

اصل یہ ہے کہ اِس دنیا میں زندگی کی دو صورتیں ہیں — ایک ہے وہ زندگی جو مبنی برحبِّ عاجلہ (75: 20) ہو، یعنی صرف آج کی بنیاد پر منصوبہ بندی۔ اور دوسری زندگی ہے مبنی برآجلہ، یعنی حیات بعد الموت کو لے کر زندگی کا نقشہ بنانا۔ اِس کے بعد میں نے رسول اور اصحاب رسول کے مختلف واقعات سنائے جو آخرت رخی زندگی کے معاملے میں عملی ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آخر میں ناظمِ اجتماع کی طرف سے لوگوں کو سوال و جواب کا موقع دیا گیا۔ چند منٹ تک کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ جامعہ کے اساتذہ اور دیگر علماء کے علاوہ مولانا کاکا سعید احمد عمری بھی اِس پروگرام میں موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہ خطاب اتنا زیادہ واضح اور فکر انگیز ہے کہ اِس کے بعد کسی سوال کی کوئی ضرورت نہیں۔ چناں چہ یہ پروگرام سوال و جواب کے بغیر ختم ہو گیا۔

پروگرام کے بعد ہم لوگ جامعہ کے دفتر میں بیٹھ گئے اور مغرب تک وہاں غیر رسمی انداز میں گفتگو ہوتی رہی۔ اِس مجلس میں ایک تعلیم یافتہ مسلمان موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ الرسالہ کے قاری ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے الرسالہ کے مطالعے سے کیا پایا۔ انھوں نے کہا کہ — سادگی اور اسلام کا فطری تصور۔

میں نے کہا یہ اُس کا صرف ایک پہلو ہے۔ الرسالہ کا اصل مقصد ہے لوگوں کے اندر مثبت طرز فکر (positive thinking) پیدا کرنا، یعنی منفی حالات کے باوجود ہمیشہ مثبت ذہن کے تحت سوچنا۔

الرسالہ کی کوشش یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اِس قسم کی ذہنی بیداری لائی جائے۔ میں نے کہا کہ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ یہی خلاصہ ایمان ہے۔ جنت میں وہی لوگ داخلہ پائیں گے جو اپنے اندر مثبت شخصیت کی تعمیر کریں۔ قرآن کے مطابق، جنت دار السلام (10:25) ہے۔ منفی ذہن کے لوگوں کو جنت میں داخلہ ملنے والا نہیں۔

اِس مجلس میں ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ میں صبر کے بارے میں بہت مضامین آتے ہیں۔ صبر کیا ہے۔ کیا صبر کا مطلب کمپرومائز (compromise) کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں، کمپرومائز الگ چیز ہے اور صبر الگ چیز۔ کمپرومائز، مصلحت (expediency) کے تحت ہوتا ہے، جب کہ صبر حکیمانہ منصوبہ بندی کا نام ہے۔

10 جون 2010 کو صبح کی نماز کے بعد ہم لوگوں نے کچھ دیر تک جامعہ کے کیمپس میں واک کیا۔ اس کے بعد ہم لوگ کاکا حامد صاحب کی رہائش گاہ پر گئے۔ میں نے پیشگی طور پر کہہ دیا تھا کہ وہاں صرف چائے ہوگی، اس کے سوا کچھ اور نہیں۔ چناں چہ اس کے مطابق عمل کیا گیا۔ یہ ایک غیر رسمی نشست تھی۔ اس میں مولانا کاکا سعید احمد عمری کے علاوہ تقریباً پندرہ علماء شریک تھے۔

اِس مجلس میں تقریباً ایک گھنٹے تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ ایک بات میں نے یہ کہی کہ موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مسلمان، عالم اور غیر عالم، عرب اور غیر عرب سب ایک مشترک برائی میں مبتلا ہیں اور وہ منفی سوچ (negative thinking) ہے۔

منفی سوچ ایک قاتل سوچ ہے۔ وہ آدمی کی دنیا کو بھی تباہ کرتی ہے اور آخرت کو بھی تباہ کر دیتی ہے۔ منفی سوچ کا پہلا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی فیضانِ خداوندی (divine inspiration) سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر وہ ربانی شخصیت نہیں بنتی جس کو قرآن میں قلبِ سلیم (26:89) کہا گیا ہے۔ منفی سوچ کا دوسرا عظیم تر نقصان یہ ہے کہ ایسا آدمی آخرت کی اعلیٰ جنت میں داخلے کے لیے محروم قرار پاتا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اِس معاملے میں سخت محتاط رہے اور کسی بھی عذر کی بنا پر وہ ادنیٰ درجے میں منفی سوچ کا شکار نہ ہو۔ ہر دوسرا نقصان بلاشبہہ منفی سوچ میں مبتلا ہونے سے کم ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ علماءِ سلف پر علمی تنقید تو علماءِ راسخین کے درمیان جاری رہی ہے، لیکن مجھے آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ علماءِ سلف کا اعتراف ہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ یہ صرف ایک غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں آپ لوگوں سے زیادہ اسلاف کا اعتراف کرتا ہوں۔ آپ لوگ تو صرف فضائل بیان کرتے ہیں۔ میں نے خاص علمی اور تاریخی اعتبار سے اسلاف کے رول کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اِس معاملے کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو کا میں بہت زیادہ اعتراف کرتا ہوں۔ یہ پہلو ہے— علوم اسلامی کی تدوین، دینی علم کا تسلسل بعد کی نسلوں میں جاری رکھنا، مصادرِ شریعت کو اس کی اصل صورت میں محفوظ رکھنا، وغیرہ۔ یہ سب کام بلاشبہہ ہمارے اسلاف نے انجام دیا ہے۔ یہ بلاشبہہ بہت بڑا کام ہے۔ اِس کام کی اہمیت اس موازنہ سے سمجھی جاسکتی ہے کہ اِس قسم کے علماء اور محققین دوسرے مذاہب میں پیدا نہیں ہوئے۔ چناں چہ دوسرے مذاہب اپنی اصل حالت میں محفوظ نہ رہ سکے۔ یہ ہمارے اسلاف کا کارنامہ ہے کہ دینِ اسلام آج پوری طرح محفوظ حالت میں موجود ہے۔

اِس معاملے کا دوسرا پہلو وہ ہے جو جدید حالات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ جدید حالات تقریباً تین سو سال سے دنیا میں موجود ہیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ اِس دور کے علماء نئے حالات کو سمجھ نہ سکے۔ وہ بدلے ہوئے حالات کے اعتبار سے مسلمانوں کو صحیح رہنمائی دینے میں ناکام رہے۔ مزید یہ کہ انھوں نے غلط اقدامات کرکے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو شدید نقصان میں مبتلا کردیا۔ مثال کے طور پر میں علماءِ دیوبند کے جہادِ آزادی کو ایک انحراف سمجھتا ہوں، وغیرہ۔

اِس مجلس میں اور بعض دوسری مجلسوں میں میں نے دیکھا کہ کاکا فیملی کے کئی افراد وہاں شریک تھے، لیکن ان کے اندر میں نے یہ انوکھی صفت پائی کہ جب کوئی سینئر شخص بولتا تھا تو فیملی کے تمام جونیئر ممبران خاموش رہ کر اس کی بات سنتے تھے۔ یہ قدیم روایت (tradition) کاکا فیملی میں اب بھی پوری طرح موجود ہے۔ کاکا حامد صاحب کے یہاں سے فارغ ہوکر ہم لوگ کمرے میں آگئے۔ یہاں صبح کا سادہ ناشتہ کیا گیا۔ یہ ناشتہ وہی تھا جو یہاں طلبا کو روزانہ دیا جاتا ہے۔ ناشتے کے وقت ہمارے ساتھ کئی علماء اور دُعاۃ موجود تھے۔ اِن لوگوں سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ مشن سے علماء بہت کم جڑے ہوئے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بات درست نہیں۔ علماء اپنے روایتی ذہن کی بنا پر اب تک الرسالہ مشن سے بہت کم جڑ سکے تھے، مگر اب خدا کے فضل سے انڈیا اور انڈیا کے باہر کے مختلف مدارس اور مکاتب فکر کے سنجیدہ علماء بڑی تعداد میں الرسالہ مشن سے جڑ گئے ہیں۔ اپریل 2010 میں الرسالہ مشن کی طرف سے دہلی میں جو دعوہ میٹ (Dawah Meet) ہوئی تھی، اس میں شرکت کرنے والے صرف علماء کی تعداد تقریباً 25 تھی۔ میں نے کہا کہ ذاتی ملاقاتوں، ٹیلی فون اور خطوط کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ علماء کے درمیان الرسالہ اور اس کے تحت تیار کردہ لٹریچر بڑے پیمانے پر مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ خاص طور پر علماء کے درمیان الرسالہ مشن کو متعارف کرنے میں میرے ساتھی مولانا محمد ذکوان ندوی کا بہت بڑا رول ہے۔ وہ ایک سنجیدہ اور معتدل مزاج کے آدمی ہیں۔ علماء سے ان کے اچھے تعلقات ہیں۔ انھوں نے خاموش پلاننگ کے ذریعے علماء کے تقریباً تمام حلقوں تک الرسالہ مشن کے دعوتی پیغام کو پہنچا دیا ہے۔ جامعہ دارالسلام کا یہ پروگرام بھی انھیں کی بالواسطہ کوششوں کے ذریعہ ممکن ہو سکا ہے۔

10 جون 2010 کی صبح کو دس بجے سے بارہ بجے تک لائبریری کے ہال میں ایک پروگرام تھا۔ اِس پروگرام کا موضوع یہ تھا: عصری اسلوب میں سیرتِ رسول کا تعارف۔ اِس پروگرام میں علماء اور دعاۃ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

میں نے اپنے خطاب میں جو کچھ کہا، وہ یہ تھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ہی ابدی مشن ہے، اور وہ دعوت ہے۔ زمانہ کے اعتبار سے اس میں جو فرق ہوتا ہے، وہ صرف طرز خطاب اور اسلوب (idiom) کے اعتبار سے ہوتا ہے، نہ کہ خود مشن کے اعتبار سے۔ پیغمبر اسلام کا مشن اول بھی دعوت ہے اور آخر بھی دعوت۔ 'حجۃ الوداع' کے بعد اصحابِ رسول کی بڑی تعداد عرب کے باہر مختلف ملکوں میں چلی گئی۔ وہاں انھوں نے لوگوں کو دینی معنی میں اسلامائز کیا، نہ کہ سیاسی معنی میں۔ موجودہ زمانے میں سیاسی اسلامائزیشن کا چرچا ہے، مگر رسول اور اصحاب رسول کے ماڈل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

میں نے کہا کہ دعوت الی اللہ کا کام ایسا نہیں ہے جس کو ایک بار کر دیا جائے اور پھر اس کی

ضرورت باقی نہ رہے۔ دعوت کا عمل ایک مسلسل عمل (continuous process) ہے، کیوں کہ انسان پیدا ہوتے ہیں اور کچھ دن زندہ رہنے کے بعد مرجاتے ہیں۔ اِس طرح بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک جنریشن کے بعد دوسری جنریشن آجاتی ہے۔ اِس لیے ہر جنریشن میں دعوتی کام کرنا ضروری ہے، تاکہ تمام انسانوں تک ان کے خالق کا پیغام پہنچ جائے۔

خطاب کے بعد سوال وجواب کا پروگرام ہوا۔ ایک سوال یہ تھا کہ قرآن میں **أعدّوا لهم ما استطعتم من قوة** (8:60) آیا ہے۔ اِس میں اعدادِ قوت سے کیا مراد ہے۔ میں نے کہا کہ خود قرآن کی آیت میں اِس کا معیار بتادیا گیا ہے، اور وہ اِرہاب ہے، یعنی وہ قوت فراہم کرو جو فریق ثانی کے نزدیک قوتِ مرہبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانے میں جنگی ہتھیار کی حیثیت قوتِ مرہبہ کی نہیں ہے، بلکہ سائنسی علوم کو یہ حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ موجودہ زمانے میں امریکا اس کی ایک مثال ہے۔ امریکا کے پاس ہر قسم کے جنگی ہتھیار موجود ہیں، لیکن ان کو استعمال کرنے کے باوجود وہ ویت نام، عراق، افغانستان، وغیرہ میں مکمل طور پر ناکام ہے۔

ایک سوال قرآن کی اِس آیت کے بارے میں تھا: **أذن للذين يقاتلون بأنهم ظُلموا** (22:39)۔ میں نے کہا کہ اِس آیت سے یہ مطلب نکالا جاتا ہے کہ کسی فریق کے ساتھ ظلم کا واقعہ ہو تو اہلِ اسلام کے لیے جنگ جائز ہوجاتی ہے، مگر یہ ایک شدید غلط فہمی ہے۔ یہ مدنی آیت ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، مکی دور میں افراد کے ساتھ بار بار ظلم کیا گیا، لیکن اُس وقت یہ آیت نہیں اتری۔ یہ آیت ہجرت کے بعد مدینہ میں اتری۔ اِس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اِس آیت میں ظلم سے مراد انفرادی ظلم نہیں ہے، بلکہ فوجی حملہ ہے، یعنی ایک بیرونی حکومت کا مسلم حکومت پر باقاعدہ فوج کے ذریعے حملہ آور ہونا۔

اِس معاملے میں دوسری بات یہ ہے کہ جب فوج کے ذریعے اِس قسم کا جارحانہ حملہ کیا جائے تو اُس وقت بھی صرف حکومت کو دفاعی جنگ (defensive war) کی اجازت ہوگی۔ غیر حکومتی افراد اور تنظیموں (NGOs) کو اُس وقت بھی مسلح جنگی کارروائی کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ موجودہ زمانے کے علماء، عرب اور غیر عرب دونوں نے، جو شدید ترین غلطی کی ہے، وہ یہ کہ انھوں نے ظلم کے نام پر

غیر حکومتی عسکریت (non-governmental militancy) کو شرعی اعتبار سے جائز قرار دیا۔ بلاشبہہ یہ ایک مہلک غلطی تھی۔ مجھے اس معاملے میں کسی عرب یا غیر عرب عالم کا استثنا نظر نہیں آتا۔

ہمارے یہاں سے قرآن کا جو انگریزی ترجمہ شائع کیا گیا ہے، اس کی بابت پروگرام کے آخر میں مولانا ریاض موسیٰ صاحب نے بتایا کہ میں نے انگریزی جاننے والے افراد کی ایک ٹیم کو یہ ترجمہ دیا۔ اور میں نے کہا کہ دوسرے انگریزی تراجم سے اِس کا تقابل کرنے کے بعد مجھ کو بتائیے کہ کون سا ترجمہ سب سے زیادہ واضح اور عصری زبان میں ہے۔ عجیب بات ہے کہ تقابل کرنے کے بعد ان لوگوں نے متفقہ طور پر کہا کہ صرف گڈ ورڈ بکس (نئی دہلی) سے شائع ہونے والا انگریزی ترجمہ اِس معیار پر پورا اترتا ہے۔ اس میں پوری طرح وضوح (clarity) ہے، اور اِسی کے ساتھ وہ اتنی آسان زبان میں ہے کہ اس کو ڈکشنری کی مدد کے بغیر پڑھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی تراجم میں سب سے زیادہ قابلِ فہم ترجمہ ڈاکٹر بشیر محی الدین (افریقہ) کا ترجمہ مانا جاتا ہے، لیکن گڈ ورڈ سے شائع ہونے والا ترجمہ اس سے بھی زیادہ واضح اور قابلِ فہم ہے۔

10 جون 2010 کو ظہر کی نماز کے بعد خطاب کا ایک پروگرام تھا۔ یہ پروگرام جامعہ کے کلیہ ہال میں کیا گیا۔ اِس میں دعاۃ اور طلبا کے علاوہ، جامعہ کے اساتذہ بھی شریک ہوئے۔ اِس پروگرام کا موضوع یہ تھا: سیرت ایک تحریک کی حیثیت سے۔ اِس موضوع پر میں نے ڈیڑھ گھنٹے کی ایک تقریر کی۔ اِس تقریر کا خلاصہ یہاں مختصر طور پر نقل کیا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ تحریک (movement) ایک ایسا عمل ہے جو ایک شخص یا گروہ کی طرف سے دوسرے گروہ کے مقابلے میں برپا ہوتا ہے۔ اِس طرح کسی تحریک کے تقاضے دو طرفہ ہو جاتے ہیں، یعنی ایک طرف داعی کی نسبت سے اور دوسری طرف مدعو کی نسبت سے۔ آپ نماز خود اپنے فیصلے کے تحت پڑھ سکتے ہیں، لیکن تحریک کی کامیابی اِس میں ہے کہ آپ دوسروں کو بھی بخوبی طور پر جانیں اور دوسروں کی رعایت کرتے ہوئے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اِس کا اعلیٰ نمونہ پایا جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں اٹھنے والی مسلم تحریکیں اپنے مطلوب نتیجے کے اعتبار سے ناکام ہوگئیں۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ اِن تحریکوں کے چلانے والے صرف اپنے آپ کو جانتے تھے، دوسروں کے بارے میں وہ پوری طرح بے خبر تھے۔

میں نے جہاں تک سیرتِ رسول کا مطالعہ کیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اِس معاملے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو ایک لفظ میں پازیٹیو اسٹیٹس کوازم (positive statusquoism) کہا جاسکتا ہے، یعنی دسروں کی مکمل رعایت کرتے ہوئے انتہائی حد تک غیر نزاعی انداز میں اپنا کام کرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس حکیمانہ پالیسی کا اعتراف برطانی مستشرق ای ای کلیٹ (EE Kellett) نے اپنے الفاظ میں اس طرح کیا ہے — انھوں نے مشکلات کا سامنا اِس عزم کے ساتھ کیا کہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑیں:

He faced adversity with the determination to wring success out of failure.

سیرتِ رسول کے اِس پہلو کو میں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور اس کی وضاحت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بہت سے واقعات بیان کیے۔

پروگرام کے بعد حاضرین کو سوال وجواب کا وقت دیا گیا، مگر کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ چناں چہ جلسے کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا۔ مولانا کا کا سعید احمد عمری نے اِس خطاب کے بارے میں کہا کہ یہ سیرتِ رسول کے موضوع پر سب سے اچھا خطاب تھا۔ کا کا صاحب نے جامعہ کے لوگوں سے کہا کہ وہ اِس پورے خطاب کو جامعہ کے ترجمان ماہ نامہ ''راہِ اعتدال'' میں شامل کریں۔

پروگرام کے خاتمہ پر ہم لوگ عصر کی نماز کے لیے مسجد میں گئے۔ مسجد کافی کشادہ، مگر نہایت سادہ تھی۔ مسجد کی دیواروں پر اُس قسم کی کوئی چیز موجود نہ تھی جو اکثر مسجدوں میں ہوتی ہے اور نمازیوں کے لیے ڈسٹریکشن کا کام کرتی ہے۔ یہ مسجد مکمل طور پر سادہ اور مکمل طور پر پرسکون تھی۔ طلبا کے اندر نہایت سنجیدگی اور ڈسپلن دکھائی دے رہا تھا۔

نماز عصر سے فراغت کے بعد ہم لوگ لائبریری میں اپنی قیام گاہ پر آ گئے۔ یہاں لائبریری کے

باہری ہال میں کئی دوسرے مقامات کے لوگ اکھٹا تھے۔ مثلاً وانیمباڑی (تمل ناڈو)، بنگلور، حیدرآباد، وغیرہ۔ اِن لوگوں سے دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک بات میں نے وقت کے بارے میں کہی۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو ہمارے پروگرام میں شرکت کے لئے آئے، لیکن وہ یہاں دیر میں پہنچے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک بے شعوری کی بات ہے۔ صحیح یہ ہے کہ آدمی کے لیے دو میں سے ایک کا اختیار ہے— یا تو وقت پر آنا، یا پھر نہ آنا۔ اِس کے سوا تیسری کوئی صورت نہیں۔

ایک سوال کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آج کل مسلمانوں کا یہ حال ہوگیا ہے کہ وہ معاملے کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ طریقہ بالکل لا حاصل ہے۔ میں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ: **اتقوا فراسةَ المؤمن، فإنه ينظر بنور الله (الترمذی، باب تفسير القرآن عن رسول الله)**۔ میں نے کہا کہ اِس حدیث کے مطابق، سچا ایمان آدمی کے اندر ایک ربانی روشنی پیدا کرتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مومن کی منصوبہ بندی کے مقابلے میں، دوسرے لوگ دفاعی پوزیشن میں آجاتے ہیں۔ اِس کے برعکس، اگر ایسا ہو کہ مسلمان دوسروں کے خلاف شاکی بنے ہوئے ہوں تو اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ فراستِ ایمانی سے محروم ہیں۔ اِس لیے ایسا ہوا ہے کہ اُن کے مقابلے میں، دوسروں کو بالادستی حاصل ہوگئی ہے۔

بنگلور کے حلقۃ الرسالہ کے تقریباً 15 لوگ ملاقات کے لیے آئے۔ میں نے اُن سے دعوت اور آخرت کے موضوع سے متعلق کچھ باتیں کہیں جس کو سن کر وہ رونے لگے۔ انھوں نے مجھ سے نصیحت کے لیے کہا۔ میں نے کہا کہ میں آپ لوگوں کو صرف ایک نصیحت کروں گا۔ وہ یہ کہ آپ آج سے اِس بات کا فیصلہ کرلیں کہ آپ کو اپنے اندر "قلب سلیم" پیدا کرنا ہے اور اِسی حال میں آپ کو جینا اور اسی حال میں مرجانا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک ایسے آدمی کی نصیحت ہے جو قبر کے کنارے کھڑے ہوکر آپ کو یہ نصیحت کررہا ہے۔

اِس موقع پر آمبور (ضلع ویلور، تمل ناڈو) کے خطیب محمد سالم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب کے تحت، اپنے علاقہ میں غیر مسلموں کے درمیان دعوتی کام کررہے ہیں۔ انھوں نے اپنی مرتب کردہ ایک کتاب مطالعہ کے لیے دی۔ اِس کتاب کا نام یہ ہے:

نسیمِ ہدایت کے جھونکے — نومسلموں کی کہانی خود انھیں کی زبانی (صفحات: 176)

یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اِس کتاب میں ماہ نامہ ارمغان (پھلت) میں شائع شدہ غیر مسلم حضرات کے مختلف انٹرویو جمع کر دئے گئے ہیں۔ اِس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے مرتب نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اِس کی اشاعت کا مقصد امت کے اندر یہ احساس جگانا ہے کہ پوری دنیا میں اشاعتِ اسلام کا کام اگر ہم نہیں کریں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے دوسرے بندوں کو اِس کام کے لیے کھڑا کر دیں گے: **وإن تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا أمثالکم۔**

جامعہ کے ایک استاد حافظ شیخ کلیم اللہ عمری مدنی ملاقات کے لیے آئے۔ انھوں نے اپنے چند کتابچے برائے مطالعہ پیش کیے۔ مثلاً محبتِ الٰہی کے ذرائع اور اخلاقیات، وغیرہ۔ اِس موقع پر جامعہ کے ایک نوجوان اور سنجیدہ استاذ مولانا حافظ محمد ابراہیم عمری نے اپنی کتاب ''انتہا پسندی اور اسلام'' مطالعے کے لیے دی۔ یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ وہ 216 صفحات پر مشتمل ہے۔

10 جون 2010 کو عصر کی نماز کے بعد جامعہ کے ایک سینئر استاد مولانا ڈاکٹر سعید احمد عمری ملاقات کے لیے آئے۔ اُن سے بعض مسائل پر گفتگو ہوئی۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے علمی انحطاط کا سبب کیا ہے، جب کہ ماضی میں وہ علمی ترقی کے اعتبار سے ممتاز مقام پر پہنچ گئے تھے۔ میں نے کہا کہ جب ہم مسلمان یا ملتِ مسلمہ کا لفظ بولتے ہیں تو شعوری یا غیر شعوری طور پر ہم اس کو ایک تسلسل کے روپ میں دیکھنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ یہ بات خلافِ واقعہ ہے۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کا یہ معاملہ سادہ طور پر مسلمانوں کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کی دو مختلف نسلوں کا معاملہ ہے، یعنی دورِ عروج کی مسلم نسلیں اور دورِ زوال کی مسلم نسلیں۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا علمی زوال ان کے اپنے نسلی زوال کا نتیجہ ہے، اور دورِ زوال میں یہ ہر قوم کے ساتھ پیش آتا ہے۔

ایک سوال یہ تھا کہ مطالعہ قرآن کا اصول کیا ہے۔ میں نے کہا کہ مطالعہ قرآن کے بہت سے اصول علماء نے لکھے ہیں، لیکن میرے اپنے تجربے کے مطابق، سب سے بڑا اصول دعا ہے۔ اِس سلسلے میں مجھ کو امام ابن تیمیہ کا طریقہ بہت پسند ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بعض مرتبہ ایک آیت کو سمجھنے کے

لیے میں نے سو سو تفسیروں کا مطالعہ کیا ہے۔ مطالعہ کے بعد میں اللہ تعالیٰ سے آیت کے فہم کی دعا کرتے ہوئے کہتا ہوں: **یا معلّم إبراهیم، علّمنی۔**

میں نے کہا کہ قرآن کو سمجھنے کہ لیے اللہ سے دعا کرنا گویا کہ کسی کتاب کو سمجھنے کے لیے اس کے مصنف سے کنسلٹ کرنا ہے۔ قرآن واحد کتاب ہے جس کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ آپ ہر لمحہ اس کے مصنف سے کنسلٹ کر سکتے ہیں۔ اِس کو سن کر ڈاکٹر سعید احمد عمری نے کہا کہ مطالعۂ قرآن کے لیے آج شاہ کلید ہاتھ آ گئی۔ اِس مجلس میں دوسرے کئی علماء موجود تھے۔ مولانا کا کا سعید احمد عمری نے کہا کہ امام ابن تیمیہ کی یہ بات ہم بہت پہلے سے جانتے تھے، لیکن آج آپ کی زبان سے اس کی اثر انگیز تفصیل سن کر اس کی معنویت پوری طرح کھل گئی۔

ایک سوال یہ تھا کہ مسلم تاریخ جو بعد کو لکھی گئی، وہ زیادہ تر مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کے ہم معنی بن گئی ہے۔ مسلم سرگرمیوں کے دوسرے پہلو مثلاً دعوت وتبلیغ کے تفصیلی واقعات اس میں شامل نہ ہو سکے۔ اب اِس کمی کی تلافی کس طرح کی جا سکتی ہے۔

میں نے کہا کہ بظاہر اب اِس کی تلافی ممکن نہیں۔ کیوں کہ تاریخ (history) ناول کی طرح محض اپنے ذہن سے نہیں لکھی جا سکتی۔ اس کے لیے ضروری معلومات (data) درکار ہے جو کہ عملاً موجود نہیں۔ میں نے کہا کہ اِس ضرورت کا احساس بہت پہلے عبد الرحمٰن بن خلدون (وفات: 1406ء) کو ہوا تھا۔ انھوں نے اِس موضوع پر ایک کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا اور اس کے آغاز میں ایک مفصل مقدمہ لکھا۔ اِس کے بعد انھوں نے سات جلدوں میں ایک کتاب لکھی جس کا نام یہ ہے: **العبر و دیوان المبتدأ والخبر فی تاریخ العرب والعجم والبربر۔**

لیکن خود ابن خلدون اپنی اِس تاریخ کو اُن اصولوں کے مطابق، نہ تیار کر سکے جس کو انھوں نے اپنے ''مقدمہ'' میں تحریر کیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مقدمہ تو وہ اپنے ذہن سے لکھ سکتے تھے، لیکن ایک نئی تاریخ لکھنے کے لیے بنیادی معلومات (data) کی ضرورت تھی اور وہ موجود نہ تھیں۔ اب اگر کوئی شخص بہت زیادہ محنت کرے تو وہ مختلف ماخذ سے اِس نوعیت کی کچھ معلومات حاصل کر سکتا ہے، لیکن وہ

معلومات اتنی زیادہ نہ ہوں گی کہ پوری تاریخ ازسرِ نو لکھی جاسکے۔

پوری مسلم تاریخ کو اب ازسرِ نو مرتب کرنا تو ممکن نہیں، لیکن میری یہ تمنا ہے کہ سیرتِ رسول کے موضوع پر ایک نئی کتاب تیار کروں۔ اگر ایک پوری ٹیم کے ساتھ احادیث رسول کا اور دوسرے متعلق ذخائر کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو امید ہے کہ سیرت کے موضوع پر ایک نئی کتاب تیار کی جاسکتی ہے۔ سیرت کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ غزواتی پیٹرن پر لکھی گئی ہیں، جب کہ سیرت کے موضوع پر صحیح کتاب وہ ہے جو دعوتی پیٹرن پر لکھی جائے۔ میں نے جزئی طور پر یہ کام کیا ہے، لیکن کلی طور پر اِس کام کو انجام دینا ابھی باقی ہے۔

آخر میں میں نے اپنی دو کتابیں اپنے دستخط کے ساتھ ڈاکٹر سعید احمد عمری کو بطور تحفہ پیش کیں— اللہ اکبر، پیغمبر انقلاب۔ اِس کے بعد مغرب کی نماز لائبریری ہال میں جماعت کے ساتھ پڑھی گئی۔ نماز میں تقریباً 15 علماء موجود تھے۔ اِس نماز کی امامت میرے ساتھی مولانا حافظ محمد ذکوان ندوی نے کی۔ مغرب کے بعد میری قیام گاہ پر کئی علماء آ گئے۔ ان سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

اِس مجلس میں میں نے جو باتیں کہیں، اُن میں سے ایک یہ تھی کہ حدیث کی کتابوں میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار استغفار کرتے تھے۔ بعض روایات کے مطابق 70 بار، بعض روایات کے مطابق، 100 بار اور بعض روایتوں کے مطابق، اِس سے بھی زیادہ بار آپ استغفار فرماتے تھے۔ شارحینِ حدیث نے اِس کی تاویل میں لمبی بحثیں کی ہیں، لیکن اصل یہ ہے کہ یہ عجز کا ظاہرہ تھا۔ عجز کی دریافت بلاشبہہ کسی مومن کی سب سے بڑی دریافت ہے۔ خدا کے تمام پیغمبر اِس معاملے میں کمال کے درجے پر تھے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر احساسِ نبوت میں نہیں جیتا، بلکہ وہ احساسِ عبدیت میں جیتا ہے۔ رب العالمین کے مقابلے میں کسی انسان کے پاس جو سب سے بڑا سرمایہ ہے، وہ صرف ایک ہے اور وہ عجز ہے۔ اِس کے بعد ہم لوگ جامعہ کی مسجد میں گئے اور وہاں عشاء کی نماز با جماعت ادا کی۔ باہر ہلکی بارش ہو رہی تھی، اِس لیے عشاء کی نماز کے بعد دوبارہ ہم لوگ لائبریری میں اپنی قیام گاہ پر واپس آ گئے۔ یہاں دوبارہ کچھ طلبا اور اساتذہ اکھٹا ہو گئے۔

مولانا سید اقبال احمد عمری نے جامعہ دارالسلام کے متعدد اساتذہ سے الرسالہ مشن کے بارے میں ان کے تاثرات معلوم کیے، جو انھیں کے الفاظ میں یہاں مختصر انقل کیے جاتے ہیں:

1- ''مولانا وحید الدین خاں صاحب سے میرے تعلقات بہت پرانے ہیں۔ مجھے ان کی مختلف تحریریں پڑھنے کو ملیں۔ ان تحریروں میں اسلام اور متعلقات اسلام پر ان کے جدید اندازِ تعبیر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اِس طرح مجھ کو مولانا سے ایک قلبی اور روحانی تعلق پیدا ہو گیا۔ جامعہ کے جشن طلائی کے موقع پر جب مولانا یہاں آئے تو اپنے دلی تعلق کی وجہ سے میں نے مولانا کو دوسرے مہمانوں کے ساتھ ٹھہرانے کے بجائے اپنے خاص کمرے میں ٹھہرایا تھا۔ میں مولانا کی تحریروں کا شائق تھا۔ چناں چہ جب مولانا کی کتاب ''تعبیر کی غلطی'' کا اشتہار دیکھا تو اس کے نسخے منگوائے۔ خود بھی پڑھا اور کچھ دوسرے احباب کو بھی پڑھنے کے لیے دیا۔ جہاں تک مولانا سے متاثر ہونے کا سوال ہے، یہاں خلاصہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان سے میں بہت متاثر ہوں۔ وہ اپنے طرزِ تعبیر میں منفرد ہیں۔ وہ اپنے طرزِ تعبیر کے موجد بھی ہیں اور متبع بھی۔ مولانا کا علم بہت گہرا ہے۔ اسلام کی تعبیر کا جو خاص ملکہ ان کو حاصل ہے، وہ منفرد اور قابلِ مطالعہ ہے۔ میں الرسالہ کا قاری ہوں۔ ابھی وہ میرے گھر آتا ہے۔ مولانا کے علمی استدلال کے انداز سے سب کو فائدہ اٹھانا چاہیے، نہ یہ کہ خواہ مخواہ اس سے علمی استفادہ کرنے سے دور رہیں''۔

(حضرت مولانا ظہیر الدین اثری رحمانی، سابق شیخ الحدیث، جامعہ دارالسلام، عمر آباد)

2- ''مولانا وحید الدین خاں صاحب کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کو وقت کی زبان اور اسلوب میں پیش کرنا، ایک کامیاب طریقہ ہے۔ جو لوگ مولانا کے لٹریچر سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، یا براہِ راست ان سے استفادہ کر رہے ہیں، اس کے مطابق، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کو پیش کرنے کا یہ طریقہ زیادہ مناسب بھی ہے اور مستحسن بھی۔ میں الرسالہ دیکھتا ہوں۔ تذکیر القرآن کا جستہ جستہ مطالعہ کیا ہے۔ آئندہ اس کو بالاستیعاب مطالعہ کرنے کا ارادہ ہے۔ مولانا کے پاس وقت کی زبان اور وقت کے اسلوب میں اسلام کو پیش کرنے کا اچھا طریقہ ہے۔''

(حضرت مولانا سید عبد الکبیر عمری، شیخ التفسیر، جامعہ دارالسلام، عمر آباد)

3- ''مولانا وحیدالدین خاں صاحب کی کتابوں میں میری سب سے پسندیدہ کتاب ''مذہب اور جدید چیلنج'' ہے۔ اِس میں مولانا نے اسلامی عقائد کو عصری دلائل کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ دورِ طالب علمی ہی سے الرسالہ میرے مطالعہ میں رہا ہے، اس کا اسلوب مجھے بہت اچھا لگتا ہے کہ معمولی واقعات کے اندر ہمارے لیے کیسے اسباق موجود ہیں۔ یہ درحقیقت قرآنی اسلوب ہے جو ایک مومن کو فراستِ ایمانی کے نتیجے میں ملتا ہے۔ مولانا سے ملنے کی خواہش بہت دنوں سے تھی، مگر اس کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ جامعہ آمد پر مولانا سے ملنے کی میری دیرینہ خواہش پوری ہوئی اور مولانا سے براہِ راست سننے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ مولانا نے بڑی محبت سے ملاقات کی اور میری قدر افزائی فرمائی۔ اِس سے مجھے اندازہ ہوا کہ مولانا کے دل میں اہلِ علم کے لیے بڑی قدر ہے۔ میں نے مولانا سے چند سوالات کئے۔ مولانا نے بڑی جامعیت کے ساتھ ان کا مختصر مگر بھرپور جواب دیا۔ جو مولانا کے وسیع مطالعہ کے علاوہ ان کے ذاتی غور وفکر کی دین ہے۔ اِس کے علاوہ، مولانا نے اپنا مثبت نقطہ نظر ہر جگہ ملحوظ رکھا۔ ایسا عام طور سے نہیں ہوتا۔ دعوتِ دین کے سلسلے میں مولانا کو میں نے بڑا فکرمند پایا۔ مولانا اسلام کے پیام امن وسلامتی کو بہت زیادہ واضح کرنے کے داعی ہیں، تاکہ اسلام کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈے کا پردہ چاک کیا جاسکے۔ مولانا کی گفتگو وتحریر میں جدید تحقیقات کے حوالے کا رنگ غالب ہے۔ وہ دینی حقائق اور جدید علمی حقائق میں ہم آہنگی ثابت کرنا چاہتے ہیں''۔

(مولانا ڈاکٹر شیخ سعید احمد عمری، استاد تفسیر وادب عربی، جامعہ دارالسلام، عمرآباد)

11 جون 2010 کو ہماری واپسی تھی۔ فجر کی نماز ہم لوگوں نے جامعہ کی مسجد میں پڑھی۔ یہاں کے دستور کے مطابق، نماز کے بعد تمام طلبا قرآن کی تلاوت کے لیے مسجد میں بیٹھ گئے۔ چوں کہ مجھے آج صبح کو روانہ ہونا تھا، اِس لیے تلاوت کو تھوڑی دیر تک ملتوی کرکے مجھے خطاب کے لیے کہا گیا۔ سامعین میں طلبا اور اساتذہ دونوں موجود تھے۔

میں نے اپنی تقریر میں جو باتیں کہیں، ان میں سے کچھ باتیں یہ تھیں۔ میں نے کہا کہ آپ دنیا میں کہیں بھی جائیے، ہر جگہ آپ کو مسجدیں اور مدرسے دکھائی دیں گے۔ مسجدیں عبادت کے مرکز

کے طور پر، اور مدرسے تعلیم کے مرکز کے طور پر۔ یہ مسجد اور مدرسے گویا کہ اسلام کا گلوبل انفراسٹرکچر (global infrastructure) ہیں۔ اِن دینی اور تعلیمی اداروں کے ذریعے اسلام نے تاریخ میں اپنا تسلسل برقرار رکھا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ آج ہم کسی روک ٹوک کے بغیر مسجدوں میں نماز ادا کرتے ہیں اور مدارس میں ہماری اگلی نسلوں کے لیے تعلیمِ دین کا نظام کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک نہایت عظیم بات ہے جس کے لیے ہمارا سینہ شکر سے معمور ہونا چاہیے۔ میں نے کہا کہ قرآن میں دربارِ فرعون کے رجلِ مومن کے بارے میں آیا ہے: **یکتم إیمانه** (40:28)۔

یہ ایک شخص کی بات نہیں، بلکہ ایک دور کی بات ہے۔ قدیم زمانہ کتمانِ ایمان کا زمانہ تھا، موجودہ زمانہ اظہارِ ایمان کا زمانہ ہے۔ یہ آزادی اصحابِ رسول کے ذریعے لائے ہوئے انقلاب کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہے۔ آپ اِس پر غور کریں تو آپ کے سینے میں شکر کا دریا جاری ہو جائے گا۔ اگر آپ اِس انقلابی تبدیلی پر غور کریں تو شکایت کا کوئی شائبہ بھی آپ کے دل میں باقی نہ رہے گا۔

اِس کے بعد میں نے خصوصی طور پر طلبا کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ دنیا دینے اور لینے (give & take) کی دنیا ہے۔ اِس دنیا کا اصول یہ ہے کہ — جتنا دینا، اتنا پانا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ دنیا کی مختلف سرگرمیوں میں داخل ہوں گے۔ آپ صرف ایک چیز کو اپنے سامنے رکھیے، اور وہ امتیاز (excellence) ہے۔ آپ جو کام بھی کریں، ممتاز طور پر کریں، حتی کہ اگر آپ موذن بنیں تو سب سے اچھی اذان دینے والے موذن بنیں۔ یہی اِس دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو حضرت علی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: **قیمة المرء ما یحسنه:**

The value of a person lies in excellence.

نماز کے بعد ہم لوگ لائبریری کے کمرے میں واپس آ گئے۔ یہاں معتمد جامعہ مولانا کا کا سعید احمد عمری اور دوسرے اساتذہ آخری ملاقات کے لیے آ گئے۔ یہاں صبح کی چائے پینے کے بعد مدراس کے لیے روانگی ہوئی۔ مولانا سید اقبال احمد عمری، مولانا فیاض الدین عمری، مولانا اسرار الحسن خطیب عمری اور مسٹر عبد الغنی (گل برگہ) مدراس تک ہمارے ساتھ تھے۔ صبح کو ہم لوگ جب واپسی کے لیے عمر آباد

سے روانہ ہوئے تو ہلکی بارش ہورہی تھی۔ یہ ہلکی بارش مدراس تک مسلسل جاری رہی۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ بارش انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کا عجیب وغریب عطیہ ہے۔ بارش اور پانی کے اتنے زیادہ فائدے ہیں کہ ان کو کسی ضخیم انسائیکلوپیڈیا میں بیان کرنا بھی ممکن نہیں۔ بارش ہمیشہ انسان کے لیے رحمتوں اور برکتوں کا نشان رہی ہے۔ یہ صرف موجودہ صنعتی زمانے کی بات ہے کہ دنیا میں وہ سنگین مسئلہ پیدا ہوا جس کو آبی کثافت (waterpollution) کہا جاتا ہے۔

موجودہ زمانے کا سب سے بڑا مسئلہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ سمندروں کے آبی ذخائر بہت بڑے پیمانے پر آلودگی کا شکار ہورہے ہیں۔ برفانی پہاڑوں کی صورت میں فریش واٹر کے جو منجمد ذخائر (گلیشئر) موجود تھے، وہ گلوبل وارمنگ کی بنا پر پگھل کر ختم ہورہے ہیں، وغیرہ۔

دوپہر کے وقت ہم لوگ مدراس ائرپورٹ پر پہنچے۔ ائرپورٹ کی نئی تعمیر کی جارہی ہے۔ چناں چہ یہاں تعمیرات کا کام بڑے پیمانے پر جاری تھا۔ ہم لوگ ائرپورٹ پر کچھ دیر بیٹھے۔ یہاں ائرپورٹ کے عملہ کے ایک ساتھی محمد آزاد صاحب ہم لوگوں کا ای ٹکٹ لے کر گئے اور انھوں نے ہمارا بورڈنگ پاس بنوا کر ہمیں دے دیا۔ ہم لوگ 11 جون 2010 کی دوپہر کو دو بجے جہاز کے اندر داخل ہوئے۔ یہ جیٹ ائرویز کی فلائٹ (9W 2256) تھی۔

ہوائی جہاز کا یہ طریقہ ہے کہ اُس میں مسافروں کی اِن فلائٹ ریڈنگ (inflightreading) کے لیے اخبار اور میگزین ہوتے ہیں۔ آج کے اخبار ٹائمس آف انڈیا (11 جون 2010) میں ایک خبر میکسکو گلف (Gulfof Mexico) سے متعلق تھی۔

یہاں 20 اپریل 2010 سے تیل کے رساؤ (oilspill) کا واقعہ ہورہا ہے۔ یہاں سطح سمندر کے نیچے کثیر مقدار میں تیل پایا جاتا ہے۔ برٹش پٹرولیم کی ٹیم یہاں عرصے سے ڈرلنگ (drilling) کا کام کررہی ہے۔ یہ ڈرلنگ سطحِ آب سے ایک میل نیچے ہورہی ہے۔ کسی ٹکنکل غلطی کی بنا پر وہاں تیل باہر نکل کر بہنے لگا۔ تیل کا یہ اخراج مسلسل جاری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں پانچ ہزار بیرل (barrel) تیل روزانہ نکل کر سمندر کے پانی میں شامل ہورہا ہے۔ مسلسل کوشش کے باوجود اب تک اُس پر قابو نہ پایا

جاسکا۔ اِس واقعے کی رپورٹ اخبار میں اِس عنوان کے تحت چھپی تھی— اوباما کی پرابلم چڑیا:

Obama's Albatross

اخبار میں اِس خبر کے ساتھ سترھویں صدی عیسوی کے ایک انگلش فلاسفر فرانسس بیکن (Francis Bacon) کا ایک قول نقل کیا گیا ہے جو صورتِ حال سے بہت مطابقت رکھتا ہے۔ اس نے کہا— ہم فطرت کو اپنے قابو میں نہیں لے سکتے، ہم صرف اس کا اتباع کر سکتے ہیں:

We cannot command Nature, except by obeying her.

اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان فطرت سے صرف اُس وقت تک فائدہ اٹھا سکتا ہے، جب کہ وہ خود فطرت کے قوانین (law of nature) کی پابندی کرے۔ انسان خود اپنا بنایا ہوا قانون فطرت کے اوپر نافذ نہیں کرسکتا۔ موجودہ زمانے میں گلوبل وارمنگ جیسے مسائل جو پیدا ہوئے ہیں، وہ اِسی اصولِ فطرت سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔

مدراس سے دہلی کی پرواز تقریباً دو گھنٹے کی تھی۔ راستے میں ہمارے ساتھی نے جہاز کے عملہ کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا۔ اس کو انھوں نے شکریے کے ساتھ قبول کیا۔ 11 جون 2010 کی شام کو ہم لوگ دہلی کے ائرپورٹ پر اترے تو یہاں ہمارے ادارے کے ایک کارکن مسٹر اشوک ائرپورٹ کے باہر موجود تھے۔ ہم لوگ ان کے ساتھ کار میں بیٹھ کر نظام الدین پہنچ گئے۔

(یہ سفرنامہ مولانا محمد ذکوان ندوی کے تعاون سے تیار کیا گیا)

Rahnuma-e-Hayat by
Maulana Wahiduddin Khan

ETV Urdu
Tuesday and Wednesday 10.30 pm
Saturday and Sunday 6.00 am

Question Answer Session by
Maulana Wahiduddin Khan

Zee Salaam
Daily 6.00 am, 11.30 am, 1.00 am

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر
اتحاد ملّت
احیاء اسلام
اسباق تاریخ
اسفار ہند
اسلام: ایک تعارف
اسلام: ایک عظیم جدوجہد
اسلام اور عصر حاضر
اسلام پندرہویں صدی میں
اسلام دور جدید کا خالق
اسلام دین فطرت
اسلام کا تعارف
اسلام کیا ہے
اسلامی تعلیمات
اسلامی دعوت
اسلامی زندگی
اقوالِ حکمت
الاسلام
الربانیۃ
*امن عالم
امہات المومنین
انسان اپنے آپ کو پہچان
*انسان کی منزل
ایمانی طاقت
آخری سفر
باغ جنت
پیغمبر اسلام
پیغمبر انقلاب
تذکیر القرآن (مکمل)
تاریخ دعوت حق
تاریخ کا سبق
تبلیغی تحریک
تجدید دین
تصویر ملت
تعارف اسلام
تعبیر کی غلطی
تعدد ازواج
تعمیر انسانیت

تعمیر حیات
تعمیر کی طرف
تعمیر ملت
حدیث رسول
حقیقت حج
حقیقت کی تلاش
حل یہاں ہے
حیات طیبہ
خاتونِ اسلام
خدا اور انسان
خلیج ڈائری
دعوت اسلام
دعوت حق
دین انسانیت
دین کامل
دین کی سیاسی تعبیر
دین کیا ہے
*دین وشریعت
دینی تعلیم
ڈائری 84-1983
ڈائری 90-1989
ڈائری 92-1991
*ڈائری 94-1993
رازِ حیات
راہ عمل
راہیں بند نہیں
روشن مستقبل
رہنمائے حیات (کتابچہ)
*رہنمائے حیات
زلزلہ قیامت
سبق آموز واقعات
سچا راستہ
سفرنامہ اسپین وفلسطین
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد دوم)
سوشلزم اور اسلام
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
*سیرتِ رسول

شتم رسول کا مسئلہ
صراطِ مستقیم
صوم رمضان
طلاق اسلام میں
ظہور اسلام
عظمت اسلام
عظمت صحابہ
عظمت قرآن
عظمتِ مومن
عقلیاتِ اسلام
علما اور دور جدید
*عورت معمارِ انسانیت
فسادات کا مسئلہ
فکر اسلامی
قال اللہ وقال الرسول
قرآن کا مطلوب انسان
قیادت نامہ
کاروانِ ملت
کتاب زندگی
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
مذہب اور جدید چیلنج
مذہب اور سائنس
*مسائل اجتہاد
مضامین اسلام
*مطالعۂ حدیث
*مطالعۂ سیرت (کتابچہ)
*مطالعۂ سیرت
*مطالعۂ قرآن
منزل کی طرف
*مولانا مودودی، شخصیت اور تحریک
میوات کا سفر
نار جہنم
نشری تقریریں
ہندستان آزادی کے بعد
ہندستانی مسلمان
*ہند- پاک ڈائری
یکساں سول کوڈ

* نئی کتابیں